شعبان المعظم
علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ
مارچ 2022

ماہ نامہ

ذوق شوق

کراچی

پیارے پیارے بچوں کے لیے بیت العلم کی نئی کتابیں

والدین و سرپرست حضرات سے گزارش

بچوں کو کہانیاں سننا اچھا لگتا ہے.... کہانیاں سننے سے ان کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں.... بچوں کی کتابوں سے دوستی ہو جاتی ہے اور آداب سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

والدین اپنے بچوں کو کتاب دوست بنانے کے لیے یہ کتابیں ضرور پڑھ کر سنائیں، کتاب پڑھنے اور سمجھنے میں بچوں کی مدد بھی کریں۔

اب Playstore سے ڈاؤن لوڈ کریں۔

GET IT ON Google Play

maktababaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk

پیغامِ الٰہی جل جلالہٗ

عبداللہ بن مسعود

(مفہوم آیت، سورۂ علق: ۴)

اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

عزیز ساتھیو!

یہ آیتِ مبارکہ ان ابتدائی آیات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نازل فرمائیں۔

اس آیت میں رب کریم نے انسانوں پر اپنے ایک انعام اور اِحسان کا ذکر فرمایا ہے کہ انسان کو سکھلانے والے اللہ تعالیٰ ہیں جنھوں نے قلم کے ذریعے اُسے تعلیم سے نوازا۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قلم، اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دین قائم رہتا نہ دنیا کے کاروبار دُرست ہوتے۔ اسی قلم کی بدولت علوم کو مدون کیا گیا، انسانوں کے حالات و مقالات کو محفوظ کیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آسمانی کتابیں علم کتابت کی برکت سے نقل ہوتی چلی آئیں۔ (تفسیر القرطبی، 20/120، دار الکتب المصریۃ، القاھرۃ)

عزیز ساتھیو! قلم ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، وہ اگرچہ اِس دنیا کو الوداع کہہ چکا ہوتا ہے، لیکن رضائے الٰہی اور خلق خدا کی خیر خواہی کے جذبے سے لکھی گئی اُس کی تحریر سدا باقی رہتی ہے اور اُس کے نام کو روشن رکھتی رہتی ہے۔

عزیز ساتھیو!

یہ پہلی وحی ہمیں قلم کی اہمیت کا سبق اور تحریر و کتابت سے وابستہ ہونے کی ترغیب دے رہی ہے۔ ہمارے بڑوں نے اسی قلم کی عظیم نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھنے کے مشغلے کو محبوب رکھا اور بڑی بڑی تصنیفات امت کو عطا فرمائیں۔

آیئے! ہم بھی عزم کریں کہ اللہ تعالیٰ کی اِس قلم کی نعمت کو محبوب بنائیں گے۔

پیغامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

رشید علی نواب شافی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے:

وہ شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔'' (مسلم)

عزیز ساتھیو! ہم سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ اکیلے رہنا کسی کے بس میں نہیں، کیوں کہ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جو لوگ ہمارے گھر کے اردگرد گھروں میں رہتے ہیں وہ ہمارے پڑوسی ہوتے ہیں، اسی طرح ہماری دکان کے اردگرد دُکان والے بھی ہمارے پڑوسی ہیں اور دین اسلام میں پڑوسیوں کے بہت سارے حقوق بیان کیے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اس قدر وصیت فرماتے رہے کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ وہ پڑوسی کو وراثت میں بھی حصہ دے دیں گے۔ (بخاری)

آپ علیہ السلام کے ایک اور ارشاد کا مفہوم ہے: ''قیامت کے دن سب سے پہلے دو جھگڑنے والے پڑوسی پیش ہوں گے۔'' (مسند احمد، مجمع الزوائد)

یعنی سب سے پہلا معاملہ بندوں کے حقوق میں دو پڑوسیوں کا ہوگا۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے کہ ہمارے کسی کام یا بات سے پڑوسیوں کو ناحق تکلیف پہنچے۔)

عزیز ساتھیو! آپ نے اوپر حدیث کے مفہوم میں پڑھ لیا ہے کہ جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو ایسا شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

اس لیے ہماری کوشش ہو کہ ہم اپنے پڑوسیوں کو راحت اور آسانی پہنچائیں اور اُن کا خیال رکھیں۔ اگر یہ کام مشکل ہو تو کم از کم اتنا تو ہم کریں کہ ہماری ذات سے انھیں کبھی تکلیف نہ ہو۔ تنگ کرنے والے پڑوسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پناہ مانگی ہے، لہٰذا آج سے ہم یہ کوشش کریں کہ ہماری ذات سے کسی پڑوسی کو تکلیف نہ ہو اور یہ دعا مانگیں کہ اے اللہ! ہمیں اچھے پڑوسی عطا فرما۔

عزیز ساتھیو! اچھا پڑوسی مل جانا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر یہ نعمت ہمیں نصیب ہے تو ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہنامہ

ذوق و شوق

کراچی

زیرِ سرپرستی:
حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شعبان المعظم ۱۴۴۳ ہجری | جلد: 17

شمارہ: 03

ناشر: محمد عارف رشید

مجلس ادارت
- مدیر: عبدالعزیز
- معاون: محمد طلحہ شاہین

سرورق السٹریٹر: سید ناصر
آرٹسٹ: قیصر شریف
کمپوزر: سعد علی
نگران ترسیل: منور عمر

اس رسالے کی تمام آمدنی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح امت کے لیے وقف ہے۔

قیمت 80

سالانہ خریداری بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک
1100/=
بذریعہ عام ڈاک
850/=

ماہنامہ ذوق و شوق میں اشتہار شائع کرنے کا مطلب تصدیق ہے نہ سفارش۔ یہ صرف عوام کو مطلع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنوعات کے بارے میں قارئین خود تحقیق فرمالیں۔

خط و کتابت کا پتہ:
ماہنامہ ذوق و شوق پی۔ او۔ بکس 17984 پوسٹ کوڈ 75300 گلشن اقبال، کراچی
Email: zouqshouq@hotmail.com
zouq shouq/ذوق شوق

اشتہارات اور سالانہ خریداری کے لیے رابطہ کریں
: 0324-2028753 , 0320-1292426
دفتری اوقات: صبح 8:00 تا 1:00
دوپہر 2:30 تا 6:00

سالانہ خریداری بذریعہ میزان بینک اکاؤنٹ:
اکاؤنٹ ٹائٹل: Bait ul ilm trust zouq o shouq
اکاؤنٹ نمبر: 0179-0103431456، سولجر بازار برانچ، کراچی
(نوٹ: بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کی رسید اس نمبر (0324-2028753) پر واٹس ایپ کردیں۔)

عنوان	مصنف	صفحہ
ثنائے ربِ جلیل (حمد)	محمد شریف شیوہ	04
بڑی شان والے (نعت)	محمد مشتاق حسین قادری	04
بلاعنوان (۱۷۵)	قرۃ العین خرم ہاشمی	07
فتح اندلس	حافظ محمد معاویہ آصف	10
موٹے صاحب	تماضر ساجد	13
صحرا کا بھوت	ش۔م۔دانش	16
بھالو کا چشمہ	حُسن آرا	20
تلافی	محمد اکمل معروف	21
بستے میں آم	اسد بخاری	25
بادشاہ کون؟	بیگم ناجیہ شعیب احمد	28
پورے چاند کی رات	حمیرا علیم	30
تیزپات	سعد علی چھیپا	31
شکریہ بھیا!	عاطر شاہین	32
مسلمان کیسے ہوا؟ (تاریخی جھلکیاں)	محمد حذیفہ رفیق زم زمی	34
ننھے نمازی	فیصل القدسی	36
فاتح کون ۸	نذیر انبالوی	38
پیڑ اور خوراک (نظم)	انصار احمد معروفی قاسمی	41
اللہ تعالیٰ کے پیارے	بنت مسعود احمد	42
بہت زبردست	زرین فاطمہ	48
شکر	ڈاکٹر الماس روحی	50
ح سے حیدرآباد	الطاف حسین	51

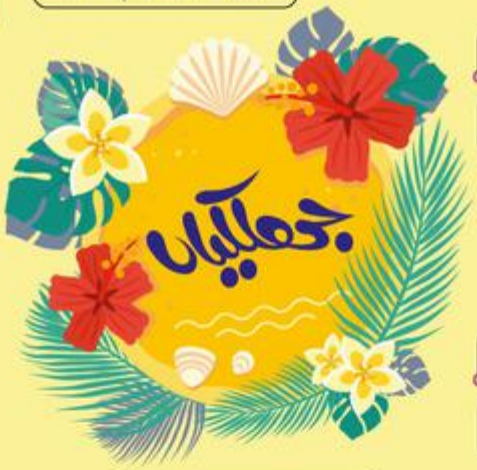

باہتمام محمد عارف رشید نے بچوں کی علمی و ذہنی ترقی و اصلاح کی خاطر ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

PARADISE BOOKS DISTRIBUTORS
Karachi: J-73, UNIT-1, GROUND FLOOR, OFF ALLAMA IQBAL ROAD, PECHS BLOCK-2, KARACHI. 021-34314981
LAHORE: SIDDIQUE MANAZIL, 2ND FLOOR, 40-ABBOT ROAD, STREET NEON PRINCE , LAHORE. 051-48430042
RAWALPINDI: OFFICE NO 2, FIRST FLOOR, STAR PLAZA, PARADISE HOUSE, RAWALPINDI. 042-3629701

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

اتوار کا دِن تھا، عصر کی نماز کا وقت تھا۔ ہم نماز کے لیے مقامی مسجد میں داخل ہوئے۔ ایک جانا پہچانا بچہ، جو برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اُس کا رُخ مغربی جانب والے داخلی دروازے کی طرف تھا، ہماری طرف بڑھا:

''السلام علیکم مدیر صاحب!''

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔'' ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مدیر صاحب! تازہ شمارہ کب آئے گا؟'' اس نے سلام کے بعد سوال داغا۔

اس کے سوال کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے نئے شمارے کا بے چینی سے انتظار ہے۔

''پریس میں ہے، ایک دو روز لگیں گے۔'' ہم نے اسے اطمینان دلایا۔

''بہت انتظار کرواتا ہے آج کل ذوق وشوق!'' اس نے اپنی بے چینی کا اظہار لفظوں سے کر دیا۔

''جی، ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اصل میں ہمارا دفتر ایک بار پھر تبدیل ہوا ہے، اس لیے تاخیر ہوگئی ہے شمارہ تیار ہونے میں۔'' ہم نے بات سنبھالی۔

''کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ کل تک مل جائے؟''

''ہوتو سکتا ہے، آپ دعا کریں۔''

''اگر کل تک آجائے تو آپ مجھے لا دیں گے؟ میرے امتحان ہوئے ہیں۔ امتحان کے بعد چھٹیاں ہوئی تھیں، کل آخری دن ہے۔ میں یہاں اپنی نانی کے گھر آیا ہوا ہوں، کل رات تک میں اپنے گھر چلا جاؤں گا۔''

''اگر آ گیا تو میں آپ کے لیے لے آؤں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ!'' جماعت کے کھڑے ہونے نے ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اگلے روز شمارہ چھپ کر دفتر آ گیا اور ہم نے قرآن کریم حفظ کرنے والے اس دس گیارہ سالہ بچے کو ماہ نامہ ذوق وشوق کا تازہ شمارہ ہدیہ کر دیا، یوں ذوق وشوق کا ایک نیک اور معصوم قاری خوش ہوگیا!

کیا آپ نے بھی کبھی کسی کو ماہ نامہ ذوق وشوق تحفے میں دیا ہے؟ کیا آپ بھی اپنے دوستوں، رشتے داروں کو، بطور خاص نیک لوگوں کو تحفہ دیتے ہیں؟

اگر ایسا ہے تو ہمیں خط لکھ کر بتائیے، ہم آپ کے خطوط شائع کریں گے اور یوں قارئین کے لیے ترغیب ہوجائے گی۔ کیا پتا کوئی تحفے کی سنت اپنالے اور آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوجائے!

لگے ہاتھوں ایک بات اور! بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے کاغذ وغیرہ کے چڑھتے ہوئے نرخ ہمیں ایک بار پھر قیمت میں اضافہ کرنے پر مجبور کر رہے ہیں، لہٰذا ذرا کمر کس لیجیے۔

عبدالعزیز

ثنائے رب جلیل

محمد شریف شیوہؔ۔لاہور

ہے موجود جو بھی یہ چھوٹا بڑا
سبھی کو خدا! تُو نے پیدا کیا
یہ دریا ، یہ صحرا ، یہ جنگل گھنے
یقیناً ہیں قدرت سے تیری بنے
بنائے ہیں تُو نے ہی رات اور دن
زمیں ، آسماں اور یہ انسان و جن
یہ گرمی ، یہ سردی ، بہار و خزاں
ہیں تیری ہی کاری گری کے نشاں!
یہ پیڑوں کے پتے ، یہ پھول اور پھل
یہ اڑتے پرندے ، یہ مچھلی ، یہ جل
ستاروں سے دامن فلک کا بھرا
کیا سبزگی سے زمیں کو ہرا
کلی کو تبسم ، گلوں کو مہک
پہاڑوں کو سختی ، ہوا کو لچک
دی آواز کوئل کو ، تتلی کو رنگ
دھنک دیکھ کے سب کی آنکھیں ہیں دنگ
یہ ہنستی ہوئی آبشاریں حسیں
زمیں پر عیاں کھیتیاں دل نشیں
ہیں بکھرے ہوئے تیرے ہر سُو کمال
شمار اُن کا کرنا ہے شیوہؔ محال

بڑی شان والے

محمد مشتاق حسین قادری۔آزاد کشمیر

جہاں میں جو محبوب رحمان والے
قرآن ان کو کہتا ہے: ایمان والے
محمد ہمارے بڑی شان والے (ﷺ)
دُرودوں ، سلاموں کا ہے وِرد جاری
عمل کرتے ہیں رب کے فرمان والے
محمد ہمارے بڑی شان والے (ﷺ)
بڑا مرتبہ میرے پیارے نبی کا
وہ جبریل جیسے ہیں دربان والے
محمد ہمارے بڑی شان والے (ﷺ)
ہمارا ہے ختم نبوت پہ ایماں
ہیں ختمِ نبوت کی پہچان والے
محمد ہمارے بڑی شان والے (ﷺ)
چلیں گے ہم ان کے ہی نقشِ قدم پر
جو بدر و اُحد کے تھے میدان والے
محمد ہمارے بڑی شان والے (ﷺ)
جو آلِ نبی کے ہیں ، اصحاب کے بھی
وہی درحقیقت ہیں قرآن والے
محمد ہمارے بڑی شان والے (ﷺ)
علی کو جو شیر خدا مانتے ہیں
وہ صدیق والے ، وہ عثمان والے
محمد ہمارے بڑی شان والے (ﷺ)
لکھی اتنی نعتیں مشتاقؔ! تُو نے
تجھے دیکھتے سب ہیں دیوان والے
محمد ہمارے بڑی شان والے (ﷺ)

۳۴
سیرت کہانی
عبدالعزیز

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مبارک زندگی اور سیرت کے اہم واقعات پر مبنی ایک پیارا سلسلہ۔

کے

کے کافر، مسلمانوں

کے ان کے ہاتھوں سے بچ نکلنے

اور مدینے میں پُرامن طریقے سے رہنے پر بہت غصہ تھے۔

چناں چہ انھوں نے عبداللہ بن ابی کو، جو انصار کا سردار تھا، ایک دھمکی آمیز خط لکھا:

''آپ لوگوں نے ہمارے آدمی (حضور ﷺ) کو پناہ دے رکھی ہے، اس لیے ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو آپ لوگ اس سے لڑائی کیجیے یا اسے (مدینے سے) نکال دیجیے یا پھر ہم سب مل کر آپ لوگوں پر حملہ کریں گے اور آپ کے سارے مردوں کو قتل کر دیں گے اور عورتوں کی بے حرمتی کریں گے۔''

عبداللہ بن ابی پہلے سے رسول اللہ ﷺ سے دشمنی رکھتا تھا کہ آپ ﷺ کی آمد کی وجہ سے اس کا بادشاہ بننے کا خواب چکنا چور ہو گیا تھا، لہٰذا جب یہ خط عبداللہ بن ابی اور اُس کے بت پرست ساتھیوں کو ملا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے جمع ہو گئے۔

حضور ﷺ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا:

''قریش کی دھمکی تم لوگوں پر بہت گہرا اثر کر گئی ہے، تم خود اپنے آپ کو جتنا نقصان پہنچا دینا چاہتے ہو قریش اس سے زیادہ تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تم اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے خود ہی لڑنا چاہتے ہو؟''

آپ ﷺ کی بات سن کر لوگ منتشر ہو گئے اور عبداللہ بن ابی نے بھی جنگ کا ارادہ ملتوی کر دیا، کیوں کہ اس کے ساتھی ڈھیلے پڑ گئے تھے، لیکن حقیقت میں قریش کے ساتھ اس کے روابط بہت مضبوط رہے۔

وہ

مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان فساد کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا، پھر اُس نے اپنے ساتھ یہودیوں کو بھی ملا رکھا تھا، تا کہ اس معاملے میں ان سے بھی تعاون حاصل کرے، لیکن وہ تو نبی ﷺ کی حکمت تھی جو رہ رہ کر فساد کی بھڑکنے والی آگ کو بجھا دیا کرتی تھی۔

(الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، ج: ۲، ص: ۵۶۳)

قریش کے لوگوں نے مسلمانوں کو بھی پیغام بھیجا:

''تم مغرور نہ ہونا کہ مکے سے صاف بچ کر نکل آئے، ہم یثرب (مدینے) ہی پہنچ کر تمھارا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

(رحمۃ للعالمین ج: ۱، ص: ۱۲۶)

اس کے بعد آپ ﷺ یا تو جاگ کر رات گزارتے یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پہرے میں آرام فرماتے۔

چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مدینے آنے کے بعد آپ ﷺ نے ایک رات فرمایا:

''کاش! آج رات میرے صحابہ میں سے کوئی نیک آدمی میرے یہاں پہرا دیتا۔''

ابھی ہم اسی حالت میں تھے کہ ہمیں ہتھیاروں کی آواز سنائی دی۔ آپ ﷺ نے پوچھا:

''کون ہے؟''

جواب ملا:

''سعد بن ابی وقاص۔''

آپ علیہ السلام نے فرمایا:

''کیسے آنا ہوا؟''

بولے:

''میرے دل میں آپ کے متعلق خطرے کا اندیشہ ہوا تو میں آپ

کے

ہاں پہرا دینے

آ گیا۔"

آپ ﷺ نے انھیں دعا دی اور پھر آرام فرمایا۔

(الصحیح لمسلم، باب فضل سعد بن ابی وقاص، ج: ۲، ص: ۲۸۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں:

"رات کو رسول اللہ ﷺ کے لیے پہرا دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا)، تب رسول اللہ ﷺ نے قبے سے سر نکالا اور فرمایا:

"لوگو! واپس جاؤ، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ کر دیا ہے۔"

(الجامع للترمذی، ابواب التفسیر، ج: ۲، ص: ۱۳۰)

یہ خطرہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات تک محدود نہ تھا، بل کہ سارے ہی مسلمان اس سے دوچار تھے، چناں چہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی مدینے تشریف لائے اور انصار نے انھیں اپنے یہاں پناہ دی تو سارا عرب ان کے خلاف متحد ہو گیا، چناں چہ یہ لوگ نہ ہتھیار کے بغیر رات گزارتے تھے اور نہ ہتھیار کے بغیر صبح کرتے تھے۔"

مدینہ منورہ میں ان پُرخطر حالات اور قریش کے غرور و تکبر سے باز نہ آنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت عطا فرما دی اور یہ آیت نازل ہوئی:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝

(سورۂ حج: ۳۹)

ترجمہ: "جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انھیں بھی اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ اپنے دفاع میں لڑیں)، کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ انھیں فتح دلانے پر پوری طرح قادر ہے۔"

اس کے بعد اور آیتیں بھی نازل ہوئیں، جن میں بتایا گیا کہ جنگ برائے جنگ نہیں ہونی چاہیے، بل کہ اس کا مقصد باطل کا خاتمہ اور اللہ تعالیٰ

کے

شعائر کا قیام ہے۔

آپ ﷺ نے دو منصوبے اختیار فرمائے:

۱۔ مکے سے شام تک جانے والی تجارتی شاہ راہ کے اردگرد یا اس شاہ راہ سے مدینے تک کے درمیانی علاقے میں آباد قبیلوں سے دوستی، تعاون اور جنگ نہ کرنے کے معاہدے کیے۔

۲۔ اس شاہ راہ پر موقع بموقع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعتیں (لشکر) بھیجیں، تاکہ کفار و مشرکین کو یہ احساس دلایا جائے کہ مسلمانوں کی کم زوری کو اللہ تعالیٰ نے دور کر دیا ہے، اب مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے طاقت ور ہو گئے ہیں اور کفار و مشرکین کو یہ بتایا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں اور مکے کے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں، ان سب باتوں سے باز آ جائیں۔

چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے صرف اپنے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بھی دستے بنا بنا کر انھیں بھیجا، جنھیں سرایا کہا جاتا ہے اور بعض مرتبہ خود بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئے، جنھیں غزوات کہتے ہیں۔

سرایا کا واحد سَرِیّہ اور غزوات کا واحد غزوہ ہے۔

سب سے پہلا سریہ، سریہ سیف البحر (ساحل سمندر) کہلاتا ہے، جس میں تیس مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے اور اُن کے امیر حضور ﷺ کے سگے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کو بنایا گیا تھا۔

ان کی ذمے داری یہ تھی کہ شام سے آنے والے قریش کے تجارتی قافلے کا پتا لگائیں۔

قریش کے قافلے میں تین سو آدمی تھے اور اس قافلے میں ابوجہل بھی تھا۔

ساحل سمندر پر عیص کے مقام پر آمنا سامنا ہو گیا اور دونوں طرف کے لوگوں نے جنگ کے لیے صفیں بنالیں، لیکن قبیلہ جُہینہ کے سردار مجدی بن عمرو نے بیچ میں پڑ کر جنگ نہ ہونے دی۔

......(جاری ہے)......

''عدیل!''

امی کی تیز آواز باورچی خانے سے آئی تو گیم کھیلنے میں مگن عدیل نے جھنجھلا کر موبائل سوفے پر پھینکا۔

''کب سے دروازے کی گھنٹی بج رہی ہے، مگر تم سن ہی نہیں رہے۔''

عدیل کی امی نے باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ڈانٹا، وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔ عدیل غصے میں بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

عدیل کو گیم کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ ہر شام وہ سب کام چھوڑ کر موبائل لے کر بیٹھ جاتا۔ عدیل کی امی کو اُس کے گیم کھیلنے سے کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ عدیل جب گیم کھیلتا تو اِس دوران میں کسی کی بات نہ سنتا اور نہ ہی اپنے چھوٹے بہن بھائی کی پروا کرتا۔ اگر اُن دونوں میں سے کوئی شور کرتا تو عدیل بلا جھجک اس پر ہاتھ اٹھاتا، جس پر کئی بار اُسے امی اور ابو سے ڈانٹ پڑ چکی تھی، مگر عدیل نے اپنی عادت نہیں بدلی۔

ابھی بھی عدیل بہت مشکل سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

''کون ہے؟''

دروازے کے پاس پہنچ کر عدیل نے بدتمیزی سے پوچھا۔

''بیٹا! میں ارشد صاحب سے ملنے آیا ہوں۔''

ایک نرم آواز پر عدیل نے دروازہ کھولا تو سامنے اظہر انکل کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''مگر بابا تو گھر پر نہیں ہیں۔'' عدیل نے جلدی سے کہا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

''بیٹا! آپ کے بابا کب تک آجائیں گے؟'' اظہر اَنکل نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

''اف! مجھے کیا پتا انکل! آپ بعد میں آجایئے گا۔'' عدیل نے ناگواری سے کہا۔ عدیل کی امی باورچی خانے سے سب سن رہی تھیں۔

اظہر انکل وہاں سے چلے گئے تو عدیل اندر آگیا۔ امی نے غصے سے عدیل کی طرف دیکھا۔

''تمھیں بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے!؟''

''امی! مجھے اظہر اَنکل اچھے نہیں لگتے، ہر وقت خواہ مخواہ نصیحت کرتے رہتے ہیں، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔'' عدیل نے منہ بنا کر کہا۔

''بہت بُری بات ہے عدیل! تم دن بدن بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔ مجھے تمھارے ابو سے بات کرنی پڑے گی۔''

امی نے سنجیدگی سے کہا اور عدیل اندر آکر دوبارہ موبائل لے کر بیٹھ گیا۔ شام کو عدیل کے ابو گھر آئے تو اُنھیں دوپہر والے واقعے سے آگاہ کیا گیا۔ انھوں نے فوراً ہی عدیل کو اپنے پاس بلایا اور پاس بٹھا کر پیار سے سمجھانے لگے:

''دیکھو عدیل بیٹا! آپ کے اظہر اَنکل میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ بہت پریشان اور دُکھی ہیں اور.....''

''کیوں ابو!؟'' عدیل نے جلدی سے بابا کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

''بیٹا! انھیں کاروبار میں بہت نقصان ہوا ہے اور اُن کا بیٹا بھی بہت بیمار ہے۔ بس اس لیے وہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے چلے آتے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، چائے پیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔'' عدیل کے ابو نے نرمی سے کہا۔

''مگر ابو! مجھے ان کا ہر وقت نصیحت کرنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ جب بھی آتے ہیں، ندیم کی تعریف کرتے ہیں اور مجھے سمجھاتے رہتے ہیں۔'' عدیل نے چھوٹے بھائی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ ندیم ایک فرماں بردار بچہ ہے اور تم کسی کی بات نہیں سنتے ہو۔'' ابو نے انصاف پسندی سے تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔

''مگر میں ندیم سے زیادہ ذہین ہوں! میرے نمبر اُس سے زیادہ آتے ہیں!'' عدیل نے فخر سے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے، مگر ندیم اخلاق میں تم سے بہت بہتر ہے۔ تمھیں بھی اپنے چھوٹے بھائی سے کچھ سیکھنا چاہیے۔''

ابو نے سنجیدگی سے کہا تو عدیل نے منہ بنا لیا۔

بہترین عنوان تجویز کرنے پر 250، دوسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 150، تیسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 100 روپے انعام دیا جائے گا۔ ''بلاعنوان'' کے کوپن پر عنوان تحریر کر کے ارسال کریں۔

عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 31 مارچ 2022 ہے۔

نوٹ: کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابل قبول نہ ہوگا۔

''اگلی مرتبہ اظہر انکل آئیں تو اُن سے تمیز سے پیش آنا۔'' ابو نے تنبیہ کی تو عدیل نے سر ہلا دیا۔

کچھ دن کے بعد ایک شام اظہر اَنکل ان کے گھر آئے۔ اس دن امی، ندیم کو لے کر کہیں گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں عدیل اور اُس کی چھوٹی بہن حرا موجود تھے۔ گھنٹی کی آواز پر دونوں بہن بھائی بھاگتے ہوئے دروازے پر گئے۔ اظہر انکل کو دیکھ کر عدیل نے منہ بنالیا، جب کہ حرا نے فوراً سلام کیا۔ اظہر انکل نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور اُن کے ابو کے بارے میں پوچھا۔

''انکل! آپ کو کتنی مرتبہ بتایا ہے کہ ابو اِس وقت گھر پر نہیں ہوتے، آپ بار بار کیوں آجاتے ہیں؟''

عدیل نے بدتمیزی سے کہا تو اَظہر اَنکل کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''بیٹا! آپ کے ابو نے ہی مجھے اس وقت آنے کا کہا تھا۔'' اظہر انکل نے شرمندگی سے کہا۔

''ابو تو رات کو آئیں گے۔ آپ بعد میں آجائیں۔ ویسے اظہر اَنکل! کیا آپ میرے ابو سے پیسے مانگنے آتے ہیں؟'' عدیل نے سوال کیا۔

''کیا مطلب!؟'' اظہر اَنکل نے حیرت سے بارہ سال کے بچے کی طرف دیکھا۔

''ابو بتا رہے تھے کہ آپ کے حالات بہت خراب ہیں تو اِس لیے شاید.....''

عدیل کی پوری بات سننے سے پہلے ہی اظہر اَنکل غصے سے مڑے اور وہاں سے چلے گئے۔

''عدیل بھائی! آپ نے اظہر اَنکل کو ناراض کر دیا ہے۔''

سات سالہ حرا نے اظہر انکل کے جانے کے بعد پریشانی سے کہا تو عدیل نے لاپروائی سے کندھے اُچکا دیے۔

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا! جو سچ ہے وہی کہا ہے۔'' عدیل یہ کہتے ہوئے اندر چلا گیا۔ رات کو ابو گھر آئے تو بہت غصے میں تھے۔ آتے ہی وہ عدیل پر برس پڑے:

''تم نے اظہر اَنکل کے سامنے غلط بیانی کیوں کی؟ میں نے کب کہا تھا کہ اظہر مجھ سے مالی مدد لینے آتا ہے؟''

ابو نے غصے سے کہا تو عدیل ڈر کے مارے کانپنے لگا۔

''ابو! وہ میں نے مذاق کیا تھا۔'' عدیل نے جھوٹ بولا۔

''تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ عدیل! مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔'' ابو نے دکھی انداز میں کہا اور وہاں سے چلے گئے۔

''عدیل! تم نے اپنے ابو کا دِل بھی دکھایا ہے اور اُن کے دوست کا بھی! بہت بُری بات ہے۔'' عدیل کی امی نے افسردگی سے کہا۔

کئی دن تک ابو نے عدیل سے کام کے علاوہ کوئی بات نہیں کی۔ عدیل کو بہت شدت سے محسوس ہوتا کہ ابو اور امی، ندیم اور حرا سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں، مگر اُس کے سامنے سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ عدیل کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے، اس کی ہر خواہش پوری کرتے، مگر اَب وہ عدیل کو اچھے بُرے سے منع کرنے کے بجائے اسے نظر اَنداز کر دیتے۔ عدیل جان بوجھ کر کوئی شرارت کرتا کہ اس کے والدین اسے ٹوکیں، مگر وہ عدیل کی شرارت کے جواب میں خاموش رہتے۔

عدیل اب بہت اداس رہنے لگا۔ اسے اب گیم کھیلنے کا بھی شوق نہیں رہا تھا۔ گیم کھیلنے کے دوران میں کبھی گھنٹی بجتی تو امی خود دروازہ کھولنے چلی جاتیں یا ندیم سے کہہ دیتیں۔ اظہر اَنکل اب بھی

اکثر شام کو اُن کے گھر آتے، مگر وہ عدیل کو مخاطب نہیں کرتے اور نہ ہی اسے کوئی نصیحت کرتے۔ ندیم اور حرا کے ساتھ ان کا انداز نارمل تھا۔ کچھ دن تک عدیل یہ سب برداشت کرتا رہا، پھر ایک دن تنگ آ کر اپنی امی کے سامنے رو پڑا:

''امی! آپ سب مجھ سے ناراض ہیں! مجھے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہے!'' عدیل نے روتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! ہم تم سے ناراض نہیں ہیں، مگر اَب ہم پہلے کی طرح تمھیں اچھی بُری باتوں پر روکتے یا ٹوکتے نہیں ہیں۔ تمھیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' امی نے نرمی سے کہا۔

''مگر امی! آپ سب میرے بھلے کے لیے ہی مجھے سمجھاتے تھے۔'' عدیل نے اعتراف کیا۔

''اب تمھیں احساس ہوا!'' امی نے مسکرا کر عدیل کی طرف دیکھا تو اُس نے سر جھکا لیا۔

''دیکھو عدیل بیٹا! تم نے اپنے ابو کے دوست کے ساتھ بہت غلط رویہ رکھا اور اِسی وجہ سے تمھارے ابو کو بہت دکھ پہنچا۔ کیا تم جانتے ہو کہ والد اگر ناراض ہو تو اُس شخص سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہو جاتے ہیں۔'' امی نے نرمی سے سمجھایا تو عدیل کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔

''مگر امی! میں نے ابو کو تو کچھ نہیں کہا! اظہر اَنکل سے ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا!'' عدیل نے کمزور لہجے میں کہا۔

''ایک حدیث سناؤں؟''

امی نے عدیل کی طرف دیکھ کر کہا تو کچھ فاصلے پر موجود ندیم اور حرا بھی والدہ کے پاس آ گئے۔ اب وہ تینوں والدہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''سب سے بہتر سلوک اور سب سے اچھا برتاؤ یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔''

(السنن للترمذی، حدیث: 1903)

''امی! صلہ رحمی کیا ہے؟''

حرا نے حیرت سے سوال کیا۔ عدیل اور ندیم بھی سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''صلہ رحمی کا مطلب ہے اپنے قریبی رشتے داروں، دوست احباب کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور بہتر تعلقات قائم کرنا۔

ایک دوسرے سے رابطہ رکھنا، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا، ہر طرح سے ایک دوسرے کا خیال رکھنا، اسے صلہ رحمی کہتے ہیں۔ اور کیا تم لوگ جانتے ہو کہ والدین کے مرنے کے بعد اُن کے لیے صدقہ جاریہ بننے کے ساتھ ساتھ ان کے دوست احباب سے اچھا سلوک رکھنے کا بھی حکم ہے۔

عدیل بیٹا! اب تم خود بتاؤ کہ تم اپنے والد کے دوست کے ساتھ ویسا سلوک کرو گے تو کیا انھیں اچھا لگے گا!؟

بیٹا! مشکل وقت میں مدد صرف روپے پیسے سے ہی نہیں ہوتی، کسی سے ہمدردی کرنا، تسلی کے دو بول بولنا بھی مدد اور صدقہ ہے۔''

امی نے تفصیل سے سمجھایا تو عدیل نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

اس شام اظہر اَنکل اور اُس کے ابو ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ امی نے چائے بنا کر عدیل کے ہاتھ اندر مہمان خانے میں بھیجی۔ عدیل کو دیکھ کر وہ دونوں چپ ہو گئے۔ عدیل نے چائے میز پر رکھی اور اَدب سے سلام کیا۔ دونوں نے سلام کا جواب دیا۔

''سوری اظہر اَنکل! میں نے اس دن آپ سے بدتمیزی کی اور آپ کا دِل دکھایا۔ کیا آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھ کر معاف کر سکتے ہیں؟''

عدیل نے اظہر اَنکل کے سامنے سر جھکا کر کہا تو اظہر اَنکل نے فوراً اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ہاں، میرا بیٹا بھی تمھاری عمر کا ہے۔ تمھاری طرح ہی ذہین، مگر ضدی!''

اظہر اَنکل نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا تو عدیل نے نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اظہر اَنکل! آپ کا بیٹا بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس کے لیے خصوصی دعا کروں گا۔ کیا آپ مجھے اپنے بیٹے سے ملوانے لے کر جائیں گے؟''

عدیل نے پوچھا تو اَظہر اَنکل نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ عدیل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس دن اظہر اَنکل وہاں سے بہت خوش خوش واپس گئے۔ رات کو کھانے پر اَبو مسکراتے ہوئے بتا رہے تھے۔

''ابو! مجھے آپ سے بھی اپنے غلط رویے کی معافی مانگنی ہے۔ میں آئندہ کسی کا دِل نہیں دکھاؤں گا۔ میں پکا وعدہ کرتا ہوں۔''

عدیل نے کہا تو اَبو نے خوشی سے اسے گلے سے لگا لیا۔

وہ خوش تھے کہ عدیل کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ انھیں یقین تھا کہ آنے والے وقت میں عدیل نہ صرف ان کی زندگی میں، بل کہ ان کے بعد بھی اپنے اچھے عمل سے نیکی کے چراغ جلاتا رہے گا اور یہی ان کی کام یابی تھی۔

فتحِ اندلس

حافظ محمد معاویہ آصف۔ ٹنڈو الہ یار

اندلس، شمالی افریقہ کے بالکل سامنے یورپ کے جنوب مغربی کنارے پر ایک حسین و جمیل جزیرہ نما ہے۔ آج کل اس میں پرتگال اور اسپین، دو ملک واقع ہیں۔ کسی زمانے میں یہ ملک مغربی دنیا کے عظیم ترین ممالک میں شمار ہوتا تھا۔

مسلمانوں نے اس پر تقریباً آٹھ سو برس تک حکومت کی۔ اسلامی تاریخ میں اس ملک کو ''اندلس'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اندلس جو کبھی اپنی وسعت میں پھیلتا ہوا موجودہ ہسپانیہ اور پُرتگال کے ساتھ ساتھ فرانس کے جنوبی علاقوں اربونہ، برنیان، قرقشونہ، اور تولوشہ وغیرہ تک جا پہنچا تھا، دورِ زوال میں اُس کی حدود جنوب مشرقی سمت میں سکڑتے ہوئے محض غرناطہ تک محدود ہو گئیں۔

فتح سندھ کی طرح اس حسین و جمیل خطۂ زمین کو بھی ولید بن عبدالملک کے زمانے میں فتح کیا گیا۔ اس فتح کا سہرا طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کے سر ہے۔

اس وقت اسپین میں ایک عیسائی بادشاہ راڈرک کی حکومت تھی، ادھر مراکش کے ساحل سبتہ پر ایک بربری سردار کاؤنٹ جولین کی حکومت تھی۔ وہ بھی عیسائی تھا، لیکن راڈرک نے اسے اپنا باج گزار بنا رکھا تھا۔ راڈرک ایک ظالم حکمران تھا، جس کی بدعنوانیوں اور رعایا پر ظلم و ستم کے قصے مشہور تھے۔

اس وقت اندلس میں غلام تو غلام تھے ہی، مزارعین کی حالت بھی ان سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔ زمین پر پوری محنت کے باوجود انھیں سکھ کی روٹی نصیب نہ تھی۔ ان کی حالت بعض معاملات میں غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ وہ اپنے بچوں کی شادی بھی امرا اور زمین داروں سے پوچھے بغیر نہ کر سکتے تھے اور اگر ایک جاگیر کے کسان کی شادی دوسری جاگیر کے کسی مزارع کی لڑکی سے ہو جاتی تو اولاد دونوں جاگیرداروں میں تقسیم کر دی جاتی۔

متوسط طبقہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور وہ معاشی طور پر دیوالیہ اور ذہنی طور پر پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ اونچا طبقہ جس پر ٹیکس معاف تھا اور وہ زمین کا مالک تھا، دو قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ فوجی اُمرا اور پادری، عموماً معیاری زندگی اور مزارعین پر ظلم کرنے کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ عیش و عشرت اور بداَخلاقی میں بھی مذہبی امرا، فوجی امرا سے کسی طرح کم نہ تھے۔

راڈرک کی بہت سی بدعنوانیوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ شاہی تربیت کے بہانے اپنی رعایا کے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے زیرِ اثر رکھتا تھا۔

جولین کی بھی ایک نوعمر لڑکی فلورنڈا، راڈرک کے زیرِ اثر رہی اور راڈرک نے اس پر بہت ظلم کیا۔ لڑکی نے اپنی مظلومیت کی اطلاع اپنے باپ جولین کو دی، جس کے نتیجے میں جولین کے دل میں راڈرک اور اُس کی حکومت کے خلاف نفرت کے شدید جذبات پیدا ہو گئے۔

وہ فوراً دارالحکومت پہنچا، اس نے اپنے جذبات کو بادشاہ پر ظاہر نہ ہونے

دیا، بل کہ صرف یہ درخواست کی کہ فلورنڈا کی ماں بستر مرگ پر ہے، اس لیے اسے واپس جانے کی اجازت دے دی جائے۔

راڈرک نے جولین کی بہت عزت افزائی کی، اسے بہت سے اعزازات سے نوازا اور رُخصت کرتے وقت اس سے فرمائش کی کہ شکار کے لیے عمدہ باز بھیجے جائیں۔ جولین نے اس کی بات کے جواب میں کہا: ''اس مرتبہ میں ایسے باز بھیجوں گا کہ آپ نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔''

یہ وہ وقت تھا جب مسلمان، موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں شمالی افریقہ کے بیش تر حصوں پر قابض ہو چکے تھے۔

جولین ایک وفد لے کر موسیٰ بن نصیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اسپین پر حملہ کر کے لوگوں کو راڈرک کے ظلم و ستم سے نجات دلائیں۔

موسیٰ نے سوچ بچار کے لیے کچھ وقت طلب کیا اور اس دوران میں خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک سے اجازت طلب کی۔

اس کے بعد کاؤنٹ جولین کے ساتھ معاہدہ کیا گیا اور اُندلس کی فتح کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے احتیاط سے اقدام کرنے کی ہدایت کی تھی، اس لیے موسیٰ بن نصیر نے پہلے صرف پانچ سو سواروں پر مشتمل ایک چھاپا مار دستہ تیار کیا اور اپنے ایک غلام ''طریف'' کو اُس کا سربراہ بنا کر اسپین کے ساحل پر چھاپا مارنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ دستہ ''الخضرا'' پر حملہ آور ہوا اور فتح مند اور کامران واپس لوٹا تو موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار سواروں پر مشتمل لشکر طنجہ سے اندلس پر چڑھائی کے لیے بھیجا۔

انھیں طنجہ سے اندلس پہنچانے کے لیے چار بڑی کشتیاں استعمال کی گئیں، جو کئی روز تک نقل و حرکت میں مشغول رہیں، یہاں تک کہ پورا لشکر اُندلس کے اس ساحل پر اُتر گیا جو آج جبل الطارق کے نام سے مشہور ہے۔

روایات میں ہے کہ کشتی پر سوار ہونے کے کچھ دیر بعد طارق بن زیاد کی آنکھ لگ گئی اور اُنھیں خواب میں سرورِ دو عالم ﷺ کی زیارت ہوئی۔

انھوں نے دیکھا کہ آں حضرت ﷺ، خلفائے راشدین اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم تلواروں اور تیروں سے مسلح سمندر پر چلتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔

جب آپ ﷺ طارق بن زیاد کے پاس پہنچے تو فرمایا: ''طارق! بڑھتے چلے جاؤ۔''

اس کے بعد طارق بن زیاد نے دیکھا کہ آں حضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے مقدس رفقا اُن سے آگے نکل کر اُندلس میں داخل ہو گئے۔

طارق بن زیاد کی آنکھ کھلی تو بے حد مسرور (خوش) تھے، انھیں فتح اندلس کی خوش خبری مل چکی تھی۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ بشارت سنائی۔ اس بشارت نے مجاہدین کے حوصلوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

مشہور واقعہ ہے کہ جب اندلس کے کناروں پر پورا لشکر جمع ہو گیا تو طارق بن زیاد نے اپنی کشتیاں جلا دیں، تاکہ فتح یا موت کے سوا لشکر کے سامنے کوئی تیسرا راستہ باقی نہ رہے۔

طارق اپنے لشکر سمیت جبل الفتح یا جبل الطارق کے مقام پر اُترے اور وہاں سے الجزیرۃ الخضرا تک کی ساحلی پٹی کسی مؤثر مزاحمت کے بغیر فتح کر لی، لیکن اس کے بعد راڈرک نے اپنے مشہور سپہ سالار تدمیر کو ایک بڑا لشکر دے کر طارق کے مقابلے کے لیے بھیجا۔

مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ اس کی پے در پے کئی لڑائیاں ہوئیں اور وہ ہر لڑائی میں شکست سے دوچار ہوا، یہاں تک کہ متواتر ہزیمتوں کے نتیجے میں اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور اُس نے اپنے بادشاہ راڈرک کو لکھا کہ جس قوم سے میرا سابقہ پڑا ہے وہ خدا جانے آسمان سے ٹپکی ہے یا زمین سے نکلی ہے۔ اب اس کا مقابلہ اس کے سوا ممکن نہیں کہ آپ بذات خود ایک لشکر جرار لے آئیں۔''

راڈرک اپنے سپہ سالار کا پیغام پا کر ستر ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک عظیم الشان لشکر تیار کر کے طارق بن زیاد کی طرف روانہ ہوا۔

دوسری طرف موسیٰ بن نصیر نے بھی طارق بن زیاد کی مدد کے لیے پانچ ہزار سپاہیوں کی کمک روانہ کی، جس کے پہنچنے کے بعد طارق بن زیاد کا لشکر بارہ ہزار پر مشتمل ہو گیا۔

وادی لکہ کے مقام پر یہ دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو طارق بن زیاد نے ایک عظیم الشان تاریخی خطبہ دیا، جس کے ایک ایک لفظ سے طارق بن زیاد کے عزم، حوصلے اور سرفروشانہ جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس خطبے کے چند جملے یہ ہیں:

لوگو! تمھارے لیے بھاگنے کی جگہ ہی کہاں ہے؟ تمھارے پیچھے سمندر ہے اور آگے دشمن، لہٰذا خدا کی قسم! تمھارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ تم خدا کے ساتھ کیے ہوئے عہد میں پورے اترو اور صبر سے کام لو۔

یاد رکھو، اس جزیرے میں تم ان یتیموں سے زیادہ بے آسرا ہو جو کسی

کنجوس کے دسترخوان پر بیٹھے ہوں۔ دشمن تمھارے مقابلے کے لیے اپنا پورا لاؤ لشکر اور اسلحہ لے کر آیا ہے۔ اس کے پاس وافر مقدار میں غذائی سامان بھی ہے اور تمھارے لیے تمھاری تلواروں کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔ تمھارے پاس کوئی غذائی سامان اس کے سوا نہیں جو تم اپنے دشمن سے چھین کر حاصل کر سکو۔

اگر زیادہ وقت اس حالت میں گزر گیا کہ تم فقر، وفاقہ کی حالت میں رہے اور کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے تو تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور اَبھی تک تمھارا جو رعب دشمن کے دلوں پر چھایا ہوا ہے اس کے بجائے دشمن کے دل میں تمھارے خلاف جرأت و جسارت پیدا ہو جائے گی، لہٰذا اس بُرے انجام کو اپنے آپ سے دور رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ تم پوری ثابت قدمی سے اس سرکش بادشاہ کا مقابلہ کرو۔

اگر تم اپنے آپ کو موت کے لیے تیار کر لو تو اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔ میں نے تمھیں کسی ایسے بُرے انجام سے نہیں ڈرایا جس سے میں خود بچا ہوا ہوں۔ نہ میں تمھیں کسی ایسے کام پر آمادہ کر رہا ہوں جس میں سب سے سستی پونجی انسان کی جان ہوتی ہے اور جس کا آغاز میں خود اپنے آپ سے نہ کر رہا ہوں۔ یاد رکھو، اگر آج کی مشقت پر تم نے صبر کر لیا تو طویل مدت تک لذت و راحت سے لطف اندوز ہو گے۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت تمھارے ساتھ ہے۔ تمھارا یہ عمل دنیا و آخرت، دونوں میں تمھارے لیے یادگار رہنے گا۔

اور یاد رکھو، جس بات کی دعوت میں تمھیں دے رہا ہوں اس پر پہلا لبیک کہنے والا میں خود ہوں۔

جب دونوں لشکر ٹکرائیں گے تو میرا عزم یہ ہے کہ میرا حملہ اس قوم کے سرکش ترین فرد راڈرک پر ہوگا اور اِن شاءاللہ! میں اپنے ہاتھ سے اسے قتل کروں گا۔

تم میرے ساتھ حملہ کرو۔ اگر میں راڈرک کی ہلاکت کے بعد ہلاک ہوا تو راڈرک کے فرض سے تمھیں سبکدوش کر چکا ہوں گا اور تم میں ایسے بہادر اور ذی عقل افراد کی کمی نہیں جنھیں تم اپنی سربراہی سونپ سکو، اور اگر میں راڈرک تک پہنچنے سے پہلے کام آ گیا (شہید ہو گیا) تو میرے اس عزم کی تکمیل میں میری نیابت تمھارا فرض ہوگا۔ تم سب مل کر اُس پر حملہ جاری رکھنا اور پورے جزیرے کی فتح کا غم کھانے کے بجائے اس ایک قتل کی ذمے داری قبول کر لینا تمھارے لیے کافی ہوگا، کیوں کہ دشمن اس کے بعد ہمت ہار بیٹھے گا۔''

کئی روز تک مسلسل راڈرک کا لشکر دادِ عیش دیتا رہا اور مومنین سربسجود فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے رہے۔

طارق کے رفقا پہلے ہی جذبہ جہاد اور شوقِ شہادت سے سرشار تھے۔ طارق بن زیاد کے اس خطبے نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ بالآخر طبلِ جنگ بجا اور فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ طارق بن زیاد کے رفقا وادی لکہ کے معرکے میں اپنے جسم و جان کو فراموش کر کے لڑے۔

یہ جنگ متواتر آٹھ دن تک جاری رہی اور بالآخر فتح و نصرت مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ راڈرک کا لشکر بُری طرح پسپا ہوا اور خود راڈرک بھی اسی تاریخی معرکے میں قتل ہوا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اسے خود طارق بن زیاد نے قتل کیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس کا خالی گھوڑا دریا کے کنارے پایا گیا، جس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوا۔

وادی لکہ کی یہ فتح جو ایک ہفتے کی صبر آزما جنگ کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئی، یورپ میں مسلمانوں کے داخلے کی تمہید تھی، جس نے پورے اندلس کے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔

مرکزی حکومت، یعنی راڈرک کی شکست کے بعد طارق بن زیاد نے اپنی فوج چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے مختلف شہروں کی طرف روانہ کی اور کاونٹ جولین کی راہ نمائی کے مطابق ملک کے طول و عرض میں اسلامی فوج کے دستے فتوحات حاصل کرنے لگے۔ مسلمانوں نے پہلا حملہ اسیجہ پر کیا، جہاں گاڈایسٹ کی شکست خوردہ فوج جمع ہو رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور قرطبہ کی فتح کا سہرا مغیث رومی کے سر بندھا۔ مالقہ اور غرناطہ بھی فتح ہو گئے، دارالحکومت طلیطلہ کے باشندے مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔

فتح کی بشارت ملتے ہی موسیٰ بن نصیر اُندلس روانہ ہو گئے۔ موسیٰ نے فتح اندلس کی تکمیل کے لیے قربونہ، اشبیلیہ اور ماروہ کو فتح کیا اور اُس کے بعد دارالحکومت طلیطلہ میں طارق کے ساتھ جا ملے۔

اسپین کے شمالی حصے کی تسخیر دونوں کی متحدہ فوج نے کی اور سرقونہ، ارغون اور برشلونہ کے علاقے فتح ہوئے۔

اندلس کی فتح کے بعد مسلمانوں نے یہاں آٹھ سو سال تک حکومت کی، جس کے دوران میں انھوں نے علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے منفرد چراغ روشن کیے اور اس خطے کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ بنایا۔

موٹے صاحب

تماضر ساجد۔ صادق آباد

میں سر جھکائے نوٹس بنانے میں مشغول تھا جب زمین سوفے سمیت لرزنے لگی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا، میز سے اپنی عینک اٹھائی اور سیڑھیوں کی جانب نظر دوڑائی۔ حسبِ توقع ''یمن عقیلی'' المعروف موٹے صاحب نپے تلے قدم اٹھاتے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

''بندۂ خدا! اطلاع دے کر اُترا کریں، کہیں ہم مسکین کسی دن زلزلہ سمجھ کر جان سے ہی نہ جائیں۔''

میری عاجزانہ درخواست زیرِ غور لائے بغیر موٹے صاحب سوفے کے پاس پہنچے اور دھم سے سوفے پر نیم دراز ہو گئے۔ سوفے بے چارے کی چیخیں نکلیں اور کھڑکی پر بیٹھے پرندے اپنے نغمے بھلائے تیزی سے اڑ گئے!

موٹے صاحب اور میرا بچپن کا ساتھ تھا۔ کہنے کو تو وہ میرے خالہ زاد تھے، لیکن دیکھنے میں متضاد، ان کا تھل تھل کرتا وجود اور میں ٹھہرا سنگل پسلی!

ہم دونوں نے بچپن اکٹھے ہی گزارا تھا۔ صحت مند تو وہ شروع سے ہی تھے۔ نہ جانے کب دوستوں نے انھیں موٹو کہہ کر پکارنا شروع کیا، جو چلتے چلتے موٹے صاحب ہو گیا۔ انھیں بھی اپنا یہ نام بہت پسند تھا۔ آخر صاحب کہہ کر عزت جو مفت میں ملتی تھی!

پچھلے دو سالوں میں ان کا وزن اتنی تیزی سے بڑھا کہ ۱۲۰ کا ہندسہ کراس کر گیا۔

ہم دونوں کی بحث جاری تھی۔ موضوعِ بحث اپنے ہی شہر کے ۳۲۰ پونڈ وزنی ایک صاحب تھے۔

''یار! کچھ تو خوفِ خدا کرو، ان صاحب کا وزن زیادہ کھانے اور سستی کی وجہ سے اتنا بڑھا ہے، تم نے یہ سستی نہ چھوڑی تو اللہ نہ کرے جو تم بھی.....'' ہم نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تمھیں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ روزانہ صبح سویرے آدھا گھنٹا چہل قدمی کرتا ہوں، چھاؤنی میدان کے پورے تین چکر لگاتا ہوں، ہاں!'' انھوں نے شہر کے سب سے بڑے میدان کا نام لیتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔

''اور جو گھر واپسی پر ڈٹ کر چار پانچ گھی سے بھرے پراٹھے کھاتے ہو، وہ!؟'' ہم نے یاد دِلایا۔

''تو اِس سے کیا ہوتا ہے؟'' انھوں نے شانِ بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''ویسے بھی تم زیادہ نہ جلا کرو، تمھیں کون سا میں روکتا ہوں کھانے سے۔'' انھوں نے میرے وزن کی طرف اشارہ کیا۔

''انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے، پچاس، پچپن کلو تو وزن ہے میرا!'' میرے فخریہ انداز نے انھیں جلا دیا۔

''چالیس کہو، چالیس!''

''چلو یہی سہی۔'' میں نے بحث ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

ہم دونوں ہر جگہ اکٹھے ہی جاتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر دوست مجھ سے استفسار کرتے:

''یہ تمھارا کزن کیا تمھارا کھانا بھی کھا جاتا ہے؟''

اور لگتا بھی تو ایسا ہی تھا۔ میں موٹے صاحب کا متضاد واقع ہوا تھا۔ دوستوں کے طعنوں سے بچنے کے لیے میں انھیں بہت نصیحتیں کرتا، لیکن وہ ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے نکال دیتے۔

ایک دن موٹے صاحب پیدل کہیں جا رہے تھے کہ اپنے ہی پیروں میں الجھ کر گر پڑے۔ وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے خود اُٹھ نہ سکے۔ بایاں ہاتھ بُری طرح مجروح ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹیسٹ کر کے انھیں خبردار کیا:

''وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ میں خون کی شدید کمی ہے۔''

میں ہنس پڑا۔

''یار! تمھیں بھی خون کی کمی ہو سکتی ہے؟''

اور موٹے صاحب منہ بسور کر رہ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے انھیں کافی ڈرایا اور تنبیہ بھی کی کہ وزن کم کریں، ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس تنبیہ نے وہ کر دِکھایا جو میری دو سالہ نصیحتیں نہ کر پائی تھیں۔ موٹے صاحب نے وزن کم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

''اب میں کیا کروں؟ فاقے کر کے میں بھوکا نہیں مر سکتا، کوئی ترکیب بتاؤ نا یار!''

فاقے سے ان کی مراد کم کھانا تھی۔ ویسے ترکیب تو میں سوچ چکا تھا۔

دوپہر کے وقت جب ان کے سامنے روٹیوں سے بھرا ہاٹ پاٹ آیا تو میں نے ایک روٹی ان کے سامنے رکھ کر باقی اٹھا لیں۔

''یہ ظلم نہ کرو یار!'' ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

ان کی مسکین شکل دیکھ کر میں نے دو مزید روٹیاں ان کے سامنے رکھیں۔ تیسری انھوں نے خود اُٹھا لی۔ میں سنجیدہ ہو گیا۔

''بھوک رکھ کر کھانا سنت ہے۔''

''اچھا تو یہ ہے تمھاری سڈول جسامت کا راز!'' انھوں نے اشتیاق بھرے انداز میں پوچھا۔

میں روٹیاں لیے باہر آ گیا۔ ایک بچی پلیٹ ہاتھ میں پکڑے گھر گھر چکر لگا رہی تھی۔ میں نے اسے بلایا اور روٹیوں کا ڈھیر اُس کے حوالے کر دیا۔ شام تک کم کھانے کی وجہ سے موٹے صاحب کا چہرہ اترا اُترا سا تھا۔

موٹے صاحب کا وزن تیزی سے کم ہونے لگا، لیکن وہ خاصے غم گین رہنے لگے تھے۔ اسی دوران میں اسکول میں فٹ بال کا مقابلہ شروع ہوا تو اُن کا موڈ بدلنے کے لیے میں نے ان کا نام بھی لکھوا دیا۔ فائنل میں ایک لڑکا کم ہوا تو اُنھیں کھیلنے کی اجازت مل گئی۔

مقررہ دن ہم میدان میں پہنچے۔ تماشائیوں کا جوش قابلِ دید تھا۔

میچ شروع ہوا تو ہمارا پلّا بھاری رہا۔ مخالف ٹیم کے دو گول کے مقابلے میں ہم تین گول کر کے فاتح ٹھہرے۔

تین میں سے دو گول میں نے کیے تھے۔ بہترین کھلاڑی کا اعزاز ملنے کی خوشی سے سرشار میں نے مخالف ٹیم کے کپتان سے ہاتھ ملایا تو اُس نے شکوہ کیا:

''یار! تم لوگ بے ایمانی کر کے جیتے ہو۔''

''بے ایمانی؟ ہم نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''اچھا! کچھ نہیں کیا!؟'' وہ کچھ زیادہ ہی دل گرفتہ تھا۔ ''تم جو خواہ مخواہ اپنے موٹے دوست کو ساتھ لائے تھے، وہ؟''

''خواہ مخواہ نہیں، وہ تو ہمارا کھلاڑی تھا۔'' میں نے وضاحت کی، لیکن اس کا موڈ بدستور خراب رہا۔

''ہمیں پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ فٹ بال کون سی ہے اور تمھارا دوست کون سا؟ تمھیں تو اپنے دوست کا پتا تھا، تبھی تم نے تین گول کر لیے۔''

میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''ہاں وہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ بہت بدتمیز لوگ ہیں، چھے لاتیں تو اُس نے خود شمار کی تھیں جو تم لوگوں نے اسے فٹ بال کی غلط فہمی میں ماریں۔'' میری بات سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔

اس دن مجھے موٹا ہونے کے فائدے معلوم ہوئے اور اُنھیں نقصان۔

اس کے بعد موٹے صاحب نے بھوک رکھ کر کھانے کی بہت مشق کی۔ اب تو اُن کا وزن اتنا کم ہو چکا ہے کہ ہمارے قریبی ساتھی بھی حیران ہوتے ہیں، البتہ وہ سارا کریڈٹ اُس سنت کو اور مجھے دیتے ہیں۔ ابھی بھی کوئی پُرانا جاننے والا حیرت کا اظہار کرتے ہوئے وزن کم کرنے کا راز پوچھے تو وہ میرے کندھے پر دھپ رسید کر کے کہتے ہیں:

''یہ ہے راز!''

اور میں اپنا کندھا سہلا کر رہ جاتا ہوں۔

☆علم ایک ایسا بادل ہے جو ہمیشہ رحمت برساتا ہے۔

☆انسان کا کتاب سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں۔

☆بڑے کام کرو، بڑے وعدے اور دعوے نہ کرو۔

☆غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔

☆کسی کے آنسو کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے دامن میں جذب کرنا انسانیت کی معراج ہے۔

☆جس کے دل میں ہمدردی ہو وہ انسان کبھی تنہا نہیں رہ سکتا۔

(ہانیہ ناز۔کراچی)

☆اپنے خیالات پر نظر رکھیے، یہ الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

☆اپنے الفاظ پر نظر رکھیے، یہ عمل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

☆اپنے اعمال پر نظر رکھیے، یہ عادات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

☆اپنی عادات پر نظر رکھیے، یہ شخصیت کا روپ دھار لیتی ہیں۔

☆اپنی شخصیت پر نظر رکھیے، یہ آپ کا مقدر بن جاتی ہے۔

(محمد حمزہ۔کراچی)

☆بے وقوف کے خیال اور عمل میں بہت کم وقفہ ہوتا ہے۔

☆عقل مند وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت پکڑے۔

☆بھلا کرو، مگر یہ سوچے بغیر کہ کس کے ساتھ کر رہے ہو۔

☆تلافی کرنے میں کبھی یہ خیال نہ کرو کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔

(امامہ بنت عبدالمنان۔کراچی)

☆ذہانت کی اصل علامت علم نہیں، بل کہ تخیل ہے۔

☆مصروف زندگی نماز کو مشکل بنا دیتی ہے، لیکن نماز مصروف زندگی کو بھی آسان بنا دیتی ہے۔

☆غیر ضروری ''تنقید'' وہ تلوار ہے جو سب سے پہلے خوب صورت تعلقات کا سر قلم کرتی ہے۔

☆ان لوگوں کے لیے کام یاب بنو جو تمھیں ناکام دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆ بدترین شخص وہ ہے جس کے ڈر سے لوگ اس کی عزت کرنے پر مجبور ہوں۔

(مہرون نساء۔حیدرآباد)

☆زبان کی لغزش قدم کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔

☆اصل طاقت برداشت کرنے میں ہے، انتقام لینے میں نہیں۔

☆پست ارادے کام یابی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

☆خامیوں کا احساس کام یابی کی کنجی ہے۔

☆جھوٹ بول کر جیت جانے سے سچ بول کر ہار جانا بہتر ہے۔

☆اللہ کے دشمنوں سے محبت کرنا اللہ تعالیٰ سے دشمنی کرنے کے مترادف ہے۔

(محمد سہیل۔لاہور)

بکھرے موتی

قارئین

صحرا کا بھوت

ش۔م۔دانش۔پائی خیل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب گاؤں میں اکا دکا لوگوں کے پاس موبائل ہوتا تھا۔ میں اس وقت چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس وقت ابا جان کھیتی باڑی کرنے کے ساتھ ساتھ گائے اور بکریاں بھی پہاڑوں کی طرف چرانے لے جاتے تھے۔ کبھی کبھار میں بھی اپنے دوست شاکا یا جگارا کے ساتھ یہ فریضہ انجام دیا کرتا تھا۔

جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں وہ سردیوں کے دن تھے۔ دسمبر کی شامیں اور راتیں اس وقت میرے لیے کافی خوف ناک ہوا کرتی تھیں، کیوں کہ میں کافی چھوٹا تھا۔

ہوتا یوں تھا کہ ابا جان گائے بکریاں چرانے پہاڑ کے دامن میں لے جاتے اور شام کے وقت انھیں وہاں سے لے کر اپنے کھیتوں کی طرف آجاتے۔ میں عصر سے کچھ پہلے جا کر کلہاڑی کے ذریعے درختوں سے ٹہنیاں (جنھیں ہماری زبان میں ''لانگھی'' کہتے ہیں۔) کاٹ لیتا تھا۔ شام کے وقت بکریاں آکر وہ کھا لیتی تھیں اور پھر ابا جان اور میں اکٹھے گھر واپس آجاتے تھے۔

جس پہاڑ کے دامن میں ابا جان بکریاں لے کر جاتے تھے وہاں سے اپنے کھیتوں تک آنے میں ایک، ڈیڑھ گھنٹا لگ جاتا تھا، اس لیے کبھی کبھار انھیں کھیتوں تک پہنچتے پہنچتے شام ہو جاتی تھی۔

اس دن ظہر کے وقت ہی سے موسم کے تیور کافی خطرناک لگ رہے تھے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے ایک بار میں نے سوچا کہ آج ''لانگھی'' کاٹنے نہ جاؤں، لیکن پھر یہ سوچ کر گھر سے نکل پڑا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ابا جان وہاں پہنچ کر انتظار کرتے رہ جائیں۔

چوں کہ ان دنوں میرے پاس اپنا موبائل نہیں تھا، اس لیے میں جی بھر کر ڈائجسٹ اور رسالے پڑھتا تھا اور میرا فارغ وقت ہمیشہ کہانیوں کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرتا تھا۔ ویسے تو عصر کی نماز کے بعد میں کرکٹ کھیلنے جاتا تھا، لیکن اس موسم میں کھیتوں کی طرف نکل جانے کی وجہ سے کرکٹ کا ناغہ ہو جاتا تھا۔

خیر، ایسی ہی کسی کہانی کے بارے میں سوچتا ہوا میں کھیتوں میں جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ایک مشکل درخت کا انتخاب کیا، کیوں کہ مجھے مشکل درختوں پر چڑھنے میں کافی مزہ آتا تھا۔ وہ درخت اتنا مشکل تھا کہ میرے کافی ماہر کزن اور اَبا جان بھی اس پر چڑھنے سے گُریز کرتے تھے۔

درخت کا تنا بالکل سیدھا اور کافی اونچا تھا، بارہ تیرہ فٹ سیدھا جانے کے بعد اُس کی شاخیں نکلتی تھیں اور یہ بلندی مجھ جیسے چھوٹے سے بچے کے لیے کافی زیادہ تھی۔ پہلے تو میں نے کافی وقت اس کوشش میں گزار دیا کہ کسی طرح کلہاڑی اس درخت کی کسی شاخ سے لٹکانے میں کام یاب ہو جاؤں، لیکن میں اس میں کام یاب نہ ہو سکا۔ کلہاڑی کا دستہ اگرچہ لمبا تھا، لیکن اتنا لمبا نہ تھا کہ کسی شاخ پر اَٹک جاتا، اور وہاں کوئی اور بھی موجود نہیں تھا جو میرے درخت پر چڑھنے کے بعد کلہاڑی مجھے دے سکتا۔ آخر کار مجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں نے دونوں پاؤں تنے پر رکھ کر ایک ہاتھ سے تنے کو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے کلہاڑی شاخ میں اٹکانے لگا۔ دو تین مرتبہ کی کوشش کے بعد میں کلہاڑی لٹکانے میں کام یاب ہو گیا، لیکن اس ذرا سی جدوجہد ہی سے میری سانس پھول گئی تھی اور مساموں سے پسینا پھوٹ پڑا تھا۔

پھر میں نے چپل اتاری اور درخت پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چوں کہ ہاتھ پاؤں میں پسینا آچکا تھا، اس لیے اوپر چڑھنے میں کافی مشکل پیش آرہی تھی، لیکن میں نے ایک بار تہیا کر لیا تھا کہ اسی درخت پر چڑھنا ہے تو اَب پیچھے ہٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ آخر کافی دیر کی اَن تھک محنت کے بعد میں اوپر چڑھنے میں کام یاب ہو ہی گیا، لیکن میں درخت پر چڑھ کر اَبھی سیدھا ہو ہی رہا تھا کہ میرا کندھا کلہاڑی سے ٹکرایا اور کلہاڑی نیچے جا گری۔ میری آنکھوں کے

سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ اب ایک بار پھر نیچے اتر کر دوبارہ اوپر چڑھنا تھا اور مجھے یہ کام لوہے کے چنے چبانے کے مترادف لگ رہا تھا۔

میں درخت سے نیچے اترا اور سانسیں درست کر کے ایک بار پھر اُوپر چڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔ چوں کہ تجربہ ہو چکا تھا اس لیے میں اس مرتبہ جلد ہی اوپر چڑھ گیا۔ اس دفعہ میں نے یہ احتیاط ملحوظ خاطر رکھی تھی کہ اوپر چڑھتے وقت میرا جسم کلہاڑی سے حتی الامکان دور رہے۔

درخت کی شاخوں پر پہنچنے کے بعد میں نے کلہاڑی پکڑی اور شاخیں کاٹنے لگا۔ میں دائیں ہاتھ سے اوپر کی شاخ پکڑے ہوئے تھا اور بائیں ہاتھ میں موجود کلہاڑی سے نچلی شاخیں کاٹتا جا رہا تھا۔ کافی دیر کی محنت کے بعد میں نے ساری شاخیں کاٹ دیں اور پھر درخت کے اوپر ہی بیٹھ کر اَبا جان کا اِنتظار کرنے لگا۔

چوں کہ بادل ظہر کے وقت سے ہی چھائے ہوئے تھے، اس لیے مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بدقسمتی سے آج میں اپنی گھڑی بھی گھر پر بھول آیا تھا۔

جب کافی وقت گزر گیا اور اَبا جان نہ آئے تو میں نے سوچا کہ شاید آج میں نے درخت جلدی کاٹ لیا ہے۔ مجھے یہ خیال بھی نہ رہا تھا کہ میرا بہت سارا وقت تو درخت پر دو مرتبہ چڑھنے ہی میں گزر گیا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بادلوں کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہے کہ شام ہو گئی ہے، لیکن ابھی شام ہونے میں دیر ہے، ورنہ ابا جان اب تک پہنچ چکے ہوتے۔

لیکن یہ میری غلط فہمی تھی، شام ہونے میں ابھی دیر نہیں تھی، بل کہ شام ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔

میں درخت سے نیچے اتر آیا اور تقریباً آدھا گھنٹا اور اِنتظار کرنے کے بعد جب ہر طرف مکمل طور پر اَندھیرا چھانے لگا تو مجھے ادراک ہوا کہ شام تو کافی وقت پہلے ہو چکی تھی، اب تو رات ہونے والی ہے۔ ابا جان شاید موسم کی وجہ سے دوسرے راستے سے گھر چلے گئے تھے جو نسبتاً چھوٹا تھا۔

وقت کا احساس ہوتے ہی میں نے کلہاڑی اٹھائی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ میں اس وقت گھر سے تین چار کلو میٹر دور تھا۔

میرے گھر کی طرف قدم بڑھاتے ہی بادلوں نے بھی برسنا شروع کر دیا۔ میں نے شکر اَدا کیا کہ ابھی صرف بوندا باندی ہی ہو رہی تھی۔

بارش شروع ہوتے ہی میں نے اپنی رفتار بڑھا دی، کیوں کہ ابھی مجھے کافی فاصلہ طے کرنا تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے ہوتے ہی بارش کی رفتار بھی تیز ہونے لگی۔ اب آگے صحرا شروع ہو رہا تھا۔ ہمارے کھیتوں سے کچھ دور آنے کے بعد دو راستے شروع ہو جاتے تھے، جن میں سے ایک صحرا کے درمیان سے گزرتا شہر تک جاتا تھا، جب کہ دوسرا صحرا کے ساتھ ساتھ ایک جانب چلتا ہوا شہر تک پہنچ جاتا تھا۔ ہم عموماً صحرا کے درمیان والا راستہ ہی استعمال کرتے تھے، اس لیے میں اسی پر چل پڑا، لیکن تھوڑا سا چلنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ درمیانی راستے کے بالکل ساتھ خانہ بدوشوں نے اپنے خیمے لگائے ہوئے ہیں اور خانہ بدوشوں کا خیال آتے ہی ان کے دو تین خوف ناک کتے بھی ذہن میں آنا ضروری تھے۔ کتوں کا خیال آتے ہی میں نے راستہ بدل لیا، کیوں کہ خانہ بدوشوں کے کتے قد میں مجھ سے بڑے تھے اور رات کے وقت کھلے رہتے تھے۔

صحرا کے کنارے کنارے چلتے ہوئے میں اس جگہ آ پہنچا جہاں کنارے والا راستہ درمیان والے راستے سے مل جاتا تھا اور دونوں کے سنگم پر پانی پینے کے لیے ایک نَل لگا ہوا تھا۔ اب ظاہر ہے اوپر سے بارش برس رہی تھی تو مجھے پیاس کہاں لگتی، لیکن مجھے گزرنا نَل کے پاس ہی سے تھا۔

جیسے ہی میں نَل کے قریب پہنچا سامنے کا منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خانہ بدوشوں کا ایک کتا منہ کھولے نَل کے بالکل ساتھ کھڑا تھا۔ کتے کو دیکھ کر میرے پیروں نے میرا وزن کھینچنے سے انکار کر دیا۔ میں ویسے بھی بھاگ نہیں سکتا تھا، ورنہ وہ کتا مجھے آسانی سے راستے ہی میں دبوچ لیتا۔ نَل سے خانہ بدوشوں کے خیمے کافی دور تھے، اس لیے مجھے خانہ بدوشوں کی طرف سے کوئی مدد ملنے کی ایک فی صد بھی توقع نہیں تھی۔

میں آنکھیں سکیڑے کتے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا اور میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ کتا بے پروا سا کھڑا تھا، لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ اس نے مجھے نہ دیکھا ہوگا۔ ویسے بھی کتے کی سونگھنے کی حس انسان کی سونگھنے کی حس سے طاقت وَر ہوتی ہے، اس لیے وہ میری بُو یقیناً پا چکا ہوگا۔

خانہ بدوشوں کے کتے کافی بڑے اور خوف ناک تھے اور علاقے کے لوگ، خصوصاً بچے ان کتوں سے بہت ڈرتے تھے۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ راستے کے کنارے کنارے چلتا جاؤں گا۔ اگر کتے نے پیچھا کرنے کی کوشش کی تو کلہاڑی تو پاس ہے ہی۔

یہ فیصلہ کرتے ہی میں ایک کنارے پر چل پڑا۔ میری نگاہیں البتہ کتے کی طرف ہی جمی ہوئی تھیں۔ کتا اسی جگہ کھڑا رہا اور میں مطمئن ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔

اچانک کتا خوف ناک آواز میں بھونکا اور میرا دِل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے جلدی سے واپس مڑ کر دیکھا اور یہ دیکھ کر میری جان

میں جان آئی کہ کتا دوسری طرف منہ کر کے بھونک رہا تھا۔

کتے سے کچھ دور آنے کے بعد میں نے اپنی رفتار تیز کر دی، کیوں کہ اب اندھیرا کافی زیادہ پھیل چکا تھا اور میرا عشا سے پہلے گھر تک پہنچ جانا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔

تھوڑا سا چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ میں نے رک کر پیچھے دیکھا، لیکن پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔ اب میرے کان پیچھے سے آتی آوازوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔ جیسے ہی مجھے دوبارہ احساس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے تو میں جلدی سے واپس مڑا اور پیچھے دیکھا، لیکن پیچھے خالی صحرا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

میں ایک بار پھر چل پڑا، لیکن میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار میں نمایاں تیزی آ گئی تھی اور اُس کی دھک دھک مجھے واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔

میں بار بار رُکتا اور چلتا تھا، جیسے ہی میں رکتا تو پیچھے آتی آواز بھی رک جاتی اور دوبارہ چلنے پر آواز دوبارہ آنے لگتی۔

اب میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا، اس لیے میں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے سوچا کہ اب پیچھے سے جو بھی آواز آتی رہے میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔

''لیکن اگر میں نے پیچھے نہ دیکھا اور پیچھے آنے والا جن یا بھوت میرے بالکل قریب آ گیا تو کیا ہوگا؟'' میں نے سوچا۔

اب مجھے پورا یقین ہو چکا تھا کہ کوئی جن یا بھوت مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ابھی گھر کافی دور تھا۔ لوگوں سے سنی ہوئی جن، بھوتوں کی کہانیاں ایک ایک کر کے مجھے یاد آ رہی تھیں اور میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

میں بھاگنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں نے فوراً اُس پر عمل کیا۔

اس مرتبہ میں نے اپنا چہرہ پیچھے گھمائے رکھا اور قدم گھر کی جانب بڑھا دیے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ منہ پیچھے ہونے پر بھی صحرا کا بھوت میرا پیچھا کرتا ہے یا نہیں؟

آواز ویسے ہی سنائی دے رہی تھی، لیکن پیچھے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اب میں نے نیچے کی طرف غور سے دیکھا اور پھر مجھے خود پر ہنسی آنے لگی۔

چوں کہ بارش کا پانی راستے میں تھوڑا تھوڑا جمع ہو چکا تھا اور وہاں ریت موجود تھی، اس لیے جب میں چلتا تو میرے جوتوں سے چپکی ہوئی ریت نیچے پانی میں گرتی تھی اور اُس سے یوں آواز پیدا ہوتی تھی جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے بھاگنے سے پہلے یہ ترکیب میرے دل میں ڈال دی تھی۔ میرا خوف دور ہو چکا تھا اور اب میں اطمینان سے گھر کی جانب جا رہا تھا۔

بقیہ صفحہ نمبر 35 پر

سوال آدھا جواب آدھا ۳۰

الطاف حسین۔ کراچی

اس کھیل میں چند جملے ہیں، ہر جملہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرے حصے میں اسی طرح کی معلومات آپ سے پوچھی گئی ہیں۔ آپ مطلوبہ معلومات ہمیں ۳۱، مارچ تک ارسال کر دیجیے، ہم آپ کو اِس کا انعام روانہ کر دیں گے۔ ایک سے زیادہ درست جوابات موصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے تین قارئین کرام کو اِنعام سے نوازا جائے گا۔ کوپن پُر کر کے ساتھ بھیجنا نہ بھولیے گا۔

۱ قرآن مجید کی سورۂ اعراف کا آغاز ''الٓمّٓصٓ'' سے ہوتا ہے..... بتایئے قرآن مجید کی کون سی سورت ہے جس کا آغاز ''الٓمّٓرٰ'' سے ہوتا ہے؟

۲ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے 175 سال کی عمر میں وفات پائی تھی..... بتایئے حضرت اِسمٰعیل علیہ السلام نے کتنے سال کی عمر میں وفات پائی تھی؟

۳ ''روشنی، توانائی کی ایک صورت ہے۔'' یہ نظریہ مشہور مسلمان سائنس دان ابن الہیثم نے پیش کیا تھا..... یہ نظریہ: ''ہم چیزوں کو اِس لیے دیکھ سکتے ہیں کہ روشنی ان سے ٹکرانے کے بعد پلٹ کر ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہے۔'' بتایئے کس مشہور مسلمان سائنس دان نے پیش کیا تھا؟

۴ چین کے دارالحکومت ''بیجنگ'' کا قدیم نام ''پیکنگ'' تھا..... آپ یہ بتایئے کہ جاپان کے دارالحکومت ''ٹوکیو'' کو ماضی میں کیا کہا جاتا تھا؟

۵ ''پنجاب میڈیکل کالج'' پاکستان کے شہر فیصل آباد میں ہے..... کیا آپ جانتے ہیں کہ ''شیخ خلیفہ میڈیکل کالج'' پاکستان کے کس شہر میں ہے؟

۶ آسٹریلیا کا قومی کھیل ''کرکٹ'' ہے..... آپ یہ بتایئے کہ اسکاٹ لینڈ کے قومی کھیل کا کیا نام ہے؟

۷ انسانی نفسیات سے متعلق علم کے ماہر کو ''سائیکولوجسٹ'' (Psychologist) کہتے ہیں..... بتایئے امراضِ قلب کے ماہر کو کیا کہا جاتا ہے؟

۸ ''ایک در بند، ہزار دَر کھلے'' اردو زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے، جس کا مطلب ہے: ''ایک ذریعہ ختم ہونے پر اللہ تعالیٰ اور بہت سے ذریعے پیدا فرما دیتا ہے''..... بتایئے ''ایک چُپ، سو سکھ'' کا کیا مطلب ہے؟

ننھے شوقین کے لیے

بھالو کا چشمہ

حُسن آرا۔ ملک وال

جنگل میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا، کیوں کہ سب اس وقت سو رہے تھے۔

ایسے میں ایک بندر جو درختوں کی شاخوں پر جھول رہا تھا، اس کی نظر سوئے ہوئے بھالو پر پڑی۔ بھالو چشمہ لگائے لگائے ہی سو گیا تھا۔

بھالو کی نظر بہت کمزور تھی، وہ ہر وقت چشمہ لگائے رکھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چشمہ لگائے سو رہا تھا۔ بندر آہستہ آہستہ بھالو کے قریب گیا اور اُس کا چشمہ اتار لیا۔ بندر نے خود چشمہ لگایا تو اُسے دھندلا دھندلا نظر آنے لگا اور وہ سامنے پڑا پتھر نہ دیکھ سکا۔ نتیجۃً اس کا پاؤں پتھر پر آیا اور وہ گر پڑا۔ چشمہ کہیں اور گر گیا۔

اب تو بندر بہت پریشان ہوا، کیوں کہ بھالو کو چشمے کے بغیر نظر نہیں آتا تھا۔ وہ چشمہ ڈھونڈنے لگا، مگر اُسے چشمہ نہیں ملا۔

تھوڑی دیر بعد لومڑی کا گزر اُدھر سے ہوا تو اُسے بھالو کا چشمہ نظر آیا۔ اس نے وہ چشمہ اٹھا لیا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک شیطانی ترکیب آئی۔ اس نے سوچا، کیوں نا بھالو کے دشمن شیر کو چشمہ دے دیا جائے، تاکہ دونوں کے درمیان چشمے کی وجہ سے لڑائی ہو۔ وہ شیر کے پاس گئی اور چشمہ اسے دے دیا۔ شیر نے اسے اس کارنامے پر شاباش دی اور چشمہ اپنے غار کے باہر لٹکا دیا، تاکہ جب بھالو یا اس کا کوئی ساتھی چشمہ لینے آئے تو وہ ان پر حملہ کر کے اپنا رعب جما سکے۔

ادھر بندر سب کو اِکٹھا کر کے بھالو کا چشمہ تلاش کرنے کو کہہ رہا تھا۔

''میں اڑ کر دیکھتا ہوں کہ چشمہ کہاں ہے۔''

کبوتر نے کہا اور چشمے کی تلاش میں اڑ گیا۔ اسے چشمہ شیر کے غار کے باہر لٹکا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے واپس جا کر سب کو بتایا کہ یہ لومڑی اور شیر کی چال ہے، اس لیے ہمیں بہت احتیاط سے وہ چشمہ واپس لانا ہوگا۔

جب بھالو بیدار ہوا تو اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کبھی کسی کی دم پر پاؤں رکھ لیتا تو کبھی کسی سے ٹکرا جاتا۔

بندر نے ایک ترکیب سوچی اور شیر کا دھیان دوسری طرف لگانے کے لیے کبوتر کو بھیجا، تاکہ وہ اسے باتوں میں اُلجھا لے اور بندر چشمہ لے آئے۔ کبوتر نے شیر کے پاس جا کر اُس کی خوشامد شروع کر دی اور اُس کا دھیان چشمے سے ہٹا دیا۔ یہ دیکھ کر بندر نے بہت احتیاط سے نظر بچا کر وہ چشمہ حاصل کیا اور لے جا کر بھالو کو دے دیا۔

اس نے بھالو سے معافی مانگی کہ وہ آئندہ کبھی بھالو کے چشمے سے نہیں کھیلے گا اور نہ ہی اسے تنگ کرے گا۔ بھالو نے بھی اسے معاف دیا۔

کچھ دیر میں شیر کو چشمے کا خیال آیا، لیکن تب تک چشمہ واپس بھالو کے پاس پہنچ چکا تھا۔

اس سازش کے بدلے میں شیر اور لومڑی کے ہاتھ کچھ نہ آیا، جب کہ بھالو کو اُس کا چشمہ واپس مل گیا۔

تلافی

محمد اکمل معروف۔ حیدرآباد

رات کے سناٹے میں چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا میں اپنے ذہن کو ماضی کے گم شدہ اوراق تلاش کرنے کے لیے دوڑا رہا تھا۔ میرے تصور میں میری والدہ کی تصویر سی لہرائی تو اُن کی آواز بھی سماعتوں سے ٹکراتی محسوس ہوئی:

''جب بھی کہیں جاؤ مجھے بتا کر جایا کرو۔ تم بغیر بتائے جاتے ہو تو میرے دل میں سو طرح کے وہم آتے ہیں۔'' انھوں نے بہت محبت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اماں! آپ تو خواہ مخواہ فکر کرتی ہیں، فضول وہم پالتی ہیں۔ میں اب بچہ تو نہیں ہوں، پورے تیرہ سال کا ہو گیا ہوں۔'' میں نے یہ کہتے کہتے اپنے جسم کو تان کر قد کو تھوڑا اور اُونچا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''دیکھو بیٹا! تم کتنے بھی بڑے ہو جاؤ، میرے لیے تو بچے ہی رہو گے۔ تم ماں کے دل کو نہیں جانتے۔ جان بھی کیسے سکتے ہو۔ جب ان چیزوں کو سمجھنے کے قابل ہو گے تو شاید ماں ہی جا چکی ہوگی۔'' وہ ٹھنڈا سانس بھر کر بولی تھیں۔

''اماں! اسکول تو جاتا ہوں اور شام کو بس چند گھنٹوں کے لیے اپنے دوستوں کے پاس کھیلنے چلا جاتا ہوں، باقی تو سارا دن آپ کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔'' میں نے قدرے منہ بنا کر جواب دیا تھا۔

''اچھا بیٹا! تمھاری مرضی۔ میں تو تمھارے بھلے کے لیے سمجھاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر روٹیاں پکانے چلی گئی تھیں۔

میں فوراً اُٹھ کر گلی میں چلا گیا۔ دور گلی کے آخری سرے پر میرے ہم جماعت گلی ڈنڈا کھیلنے میں مگن تھے، میں بھی بھاگ کر ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو گیا تھا۔ دو گھنٹے کس طرح گزرے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ گھر پہنچا تو اماں نے مجھے کھانا کھانے کے لیے کہا۔ ابا اپنے کام سے واپس آ کر چارپائی پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی چپل اٹھا کر مارنے کے لیے لپکے۔

''جب دیکھو باہر کھیل میں مگن رہتا ہے۔ کئی مرتبہ سمجھایا ہے، مگر اِس کی سمجھ میں نہیں آتا۔''

یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھے، مگر اماں نے انھیں روک دیا اور چپل ان کے ہاتھ سے چھین کر نیچے رکھ دی۔

''آپ غصہ نہ کریں۔ بچہ ہے، سمجھ جائے گا۔ زیادہ دور نہیں جاتا، یہیں گلی کے کنارے کھیلتا رہتا ہے۔''

انھوں نے مجھے ایک بار پھر ابا کی مار سے بچا لیا تھا۔ وہ چارپائی پر جا بیٹھے، مگر زور زور سے بولتے رہے:

''کھیل کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ہر سال جماعت میں بڑی مشکل سے پاس ہوتا ہے۔ پھر محلے میں لڑکوں سے جھگڑے الگ کرتا ہے۔ آئے روز اِس کی شکایتیں آتی ہیں۔''

دروازے کی گھنٹی بجی تو میرا ذہن ماضی کے واقعات سے باہر نکل آیا۔ میں نے دروازے

پر جا کر دیکھا تو چاچا نذیر احمد کھڑے تھے۔

''السلام علیکم چاچا!''

میں نے سلام کیا تو اُنھوں نے محبت سے جواب دیا اور بولے:

''بیٹا! کل شعیب واپس آ رہا ہے۔ گھر میں چھوٹی سی تقریب رکھی ہے اس کے آنے کی خوشی میں۔ تم کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔'' وہ یہ کہہ کر چلے گئے اور میں اثبات میں سر ہلا کر واپس آ بیٹھا۔ سوچوں کا سلسلہ وہیں سے شروع ہو گیا جہاں منقطع ہوا تھا۔

''اماں! یہ اسکول کی پڑھائی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے اب اور نہیں پڑھنا، مجھے بس کوئی ہنر سیکھنا ہے۔''

میں نے دل کڑا کر کے اماں کو کہہ ہی دیا۔ میری بات سن کر اماں گویا سکتے

میں آ گئیں۔ خالی آنکھوں سے کافی دیر تک مجھے دیکھتی رہیں اور پھر آنسو ٹپ ٹپ ان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

''تمھاری آوارگی دیکھ کر میں اسی دن سے ڈرتی تھی۔ حد سے زیادہ کھیل کود میں دھیان دینے سے یہی ہونا تھا۔ دیکھو وجاہت! تم اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے ہو۔ وہ سارا دن مزدوری کر کے تمھیں پڑھا رہے ہیں، صرف اس امید پر کہ تم پڑھ لکھ کر قابل افسر بنو گے۔ اگر ابا نے تیری بات سن لی تو گھر میں قیامت آ جائے گی۔''

وہ بہت گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی تھیں، مگر میں کہاں سننے والا تھا۔ ان کی بات پر توجہ دیے بغیر پھر گلی میں نکل گیا۔ سامنے سے چاچا نذیر احمد کا بیٹا شعیب آتا دکھائی دیا۔ وہ میرا ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ ہم جماعت بھی تھا۔ چاچا بھی میرے ابا کی طرح محنت مزدوری کرتے تھے اور شعیب دل لگا کر پڑھتا اور ہر سال جماعت میں اول آتا تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کرنا چاہا، مگر وہ میرے قریب چلا آیا۔

''کہاں گھوم پھر رہا ہے وجی! کبھی گھر میں ٹِک کر پڑھ بھی لیا کر۔'' اس نے نرمی سے کہا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''جا بھائی! جا، اپنا کام کر، تُو ہے تو سہی پڑھنے اور خاندان کا نام روشن کرنے کے لیے۔'' میں نے اسے بہت حقارت سے جواب دیا تھا۔ خاموشی سے سر جھکائے وہ آگے بڑھ گیا تھا۔

پیاس کا احساس ہوا تو ذہن سوچ کے سمندر سے باہر نکل آیا۔ میں نے صراحی جھکا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور پانی پینے لگا تو ایک مرتبہ پھر اماں کی نصیحت یاد آئی:

''پانی تین گھونٹ میں پیا کرو وجی! ایک دم غٹ غٹ کر کے نہ پیا کرو۔ یہ پیارے نبی ﷺ کی سنت بھی ہے اور فائدہ مند بھی۔'' اماں گو کہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں، مگر وہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور سنت طریقوں سے پوری طرح واقف تھیں۔

اماں کی نصیحت یاد آتے ہی میں نے پانی رک رک کر پینا شروع کر دیا۔

چار پائی پر بیٹھتے ہی یادوں کا سلسلہ وہیں سے شروع ہو گیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

ایک صبح جب کہ اماں ابا سو کر بھی نہ اٹھے تھے میں خاموشی سے گھر سے نکل پڑا اور بھاگتے بھاگتے گاؤں کی حدود سے بہت دور آ گیا۔ جب دوڑتے دوڑتے تھک گیا تو آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ بالآخر ریل کی پٹڑی تک پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک مال گاڑی میں سوار ہو کر میں انجانی منزل کا مسافر بن چکا تھا۔ ایک ایسی منزل جس کی کوئی سمت نہ تھی اور سارا راستہ ٹھوکروں سے بھرا ہوا تھا۔ آٹھ سال تک زمانے کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ شہر شہر کی خاک چھانی اور طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ کوئی ایسا نہ ملا جو اماں کی طرح بُرا بھلا بتائے یا ابا کی طرح ڈانٹ ڈپٹ کر اور سختی کر کے بُرے راستے پر چلنے سے منع کرے، مگر کب تک؟ آخر کب تک اپنے گھر سے بھاگتا رہتا۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا شوق پورا ہو چکا تھا، سو ایک دن دوبارہ ایک ٹرین میں سوار ہو کر واپس اپنے گاؤں لوٹ آیا۔

منہ پر کپڑا لپیٹے گھر کے قریب پہنچا تو دروازے پر لٹکتا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میں چاچا نذیر احمد کے گھر میں داخل ہوا تو کچھ دیر تک تو وہ مجھے پہچانے ہی نہیں، پھر اچانک گلے لگ کر رونے لگے۔ ان کی زبانی پتا چلا کہ اماں میرے گھر سے بھاگ جانے کے صدمے کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکیں اور اپنی دائمی منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں تو منزل سے بھٹک چکا تھا، لیکن وہ اپنی اصل منزل کی مسافر بن گئی تھیں۔ ابا گھر کی ویرانی سے گھبرا کر اپنا دماغی توازن برقرار نہ رکھ سکے اور اُنھیں علاج کی غرض سے ایک ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا، جہاں سے وہ واپس نہ آئے اور اماں سے جا ملے۔

میری نادانی اور خودسری کی وجہ سے ایک ہنستا بستا گھر اُجڑ گیا تھا۔

سوچ کا دھارا اپنے اختتام کو پہنچا تو آنسوؤں کا ایک سمندر تھا جو میری آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔

اگلے روز چاچا نذیر کے گھر گیا تو شعیب آ چکا تھا۔ وہ بہت محبت اور خلوص سے ملا۔ پاک فوج میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھا اور آج بھی خلوص و محبت کا پیکر تھا۔ مجھے اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے بھی شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

جو لوگ اپنا وقت برباد نہیں کرتے، اپنے ماں باپ کی باتوں کو دھیان سے سن کر عمل کرتے ہیں، وہ شعیب کی طرح ایک کام یاب زندگی گزارتے ہیں اور میرے جیسے لوگ احساسِ شرمندگی سے سر نہیں اٹھا پاتے۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے الفاظ یاد آ گئے: ''جا بھائی! جا، اپنا کام کر، تُو ہے تو سہی پڑھنے اور خاندان کا نام روشن کرنے کے لیے۔''

وہ واقعی خاندان کا نام روشن کر چکا تھا اور میں روشنیوں سے نکل کر اندھیروں میں بھٹکتا رہا تھا۔

شعیب کچھ دن رہ کر دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر واپس چلا گیا۔ چاچا بھی باپ کی طرح ہوتے ہیں۔

اس کے جانے کے بعد میں چاچا اور چاچی کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔ وہ وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتا اور میں چاچا چاچی کی خدمت کرتے ہوئے اپنے ماں باپ کو نظر انداز کرنے کی تلافی کرنے لگا۔

حافظ محمد دانش عارفین حیرت۔ لاہور

۸۔ اسحاق اخرس

"آہ...... اوہ...... نہیں...... تم...... چھوڑو...... کیا کر رہے ہو...... نہیں...... بس کرو......"

رات کا وقت تھا۔ اصفہان شہر کے لوگ میٹھی نیند سو رہے تھے۔

ایسے میں شہر کے کنارے پر موجود مکتب سے چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس چیخ و پکار کو سُن کر مکتب کے طلبہ ہی نہیں آس پاس کے رہائشی بھی سہانی نیند سے جاگ اٹھے۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر باہر آگئے اور آپس میں بات چیت کرنے لگے۔

"ارے! یہ کون چیخ رہا ہے؟" کسی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"لگتا ہے کسی کو مدد کی ضرورت ہے؟" ایک دوسرے شخص نے قیاس کیا۔

چیخ و پکار کی آوازیں اب بھی باآواز بلند سنائی دے رہی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ آواز مکتب کی سمت سے آرہی ہے۔" کسی شخص نے آواز کی سمت کا اندازہ لگایا۔

"ہاں، لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" سب نے اس شخص کی تائید کی۔

"تو چلو، پھر اُس طرف ہی چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا ماجرا ہے۔" کسی نے رائے دی۔ سب لوگ مکتب کی طرف بڑھنے لگے۔

مکتب کے طالب علم چیخ و پکار سن کر مکتب سے باہر نکلے، مگر باہر آکر اُنھیں محسوس ہوا کہ آواز تو مکتب کے اندر سے ہی آرہی ہے۔ اتنے میں شہری بھی وہاں پہنچ گئے۔

"یہ چیخ و پکار کیسی ہے؟" کسی شہری نے پوچھا۔

سوال سن کر ایک طالب علم نے جواب دیا:

"ہم سمجھے تھے کہ آواز باہر سے آرہی ہے، لیکن باہر نکل کر محسوس ہوا کہ یہ تو اندر سے آرہی ہے۔"

"تو چلو، پھر چل کر دیکھتے ہیں کہ کون پریشان ہے۔" ایک اور شہری نے مشورہ دیا۔

چیخ و پکار بدستور سنائی دے رہی تھی۔ سب نے مل کر مکتب کے درسی کمروں کو دیکھنا شروع کیا، مگر کسی کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے؟"

"لیکن چیخ و پکار تو اب بھی سنائی دے رہی ہے۔"

"یہ آواز رہائشی کمروں کی طرف سے آرہی ہے، اس طرف چلتے ہیں۔"

اب سب رہائشی کمروں کی طرف جانے لگے۔

اچانک چیخ و پکار رُک گئی۔ سب رہائشی کمروں میں دیکھ رہے تھے کہ معلوم ہو سکے کون چلّا رہا تھا، مگر رہائشی کمروں میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ سب تو باہر موجود تھے۔

"آخر یہ کون چیخ رہا تھا؟ کیوں چیخ رہا تھا؟ اور وہ ہے کہاں؟" سب ہی کی زبان پر یہ سوالات موجود تھے۔

ابھی لوگوں کی حیرت ختم نہیں ہوئی تھی کہ اچانک لوگوں کو بہت ہی خوب صورت آواز میں قرآن مجید کی تلاوت سنائی دینے لگی۔ رات کے وقت مترنم آواز میں تلاوت سن کر لوگ اور زیادہ حیران ہونے لگے۔

"یہ آواز تو مکتب کی مسجد سے آرہی ہے۔" کسی نے کہا۔

"چلو، دیکھتے ہیں کہ مسجد میں کون ہے؟"

"اچھی بات ہے۔"

پھر وہ سب مل کر مسجد کی طرف جانے لگے۔ رات کے اس پہر مسجد پوری طرح روشن تھی، جو کہ انتہائی حیران کن بات تھی، کیوں کہ مشعلوں

سے مسجد کبھی بھی اس طرح روشن نہیں ہوئی تھی۔ روشن مسجد میں ایک بہت ہی خوب صورت چہرے والا شخص اعلیٰ کپڑے پہنے تلاوت کر رہا تھا۔ لوگ اسے دیکھ رہے تھے اور اُس کی قراءت کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔

''ارے!'' کسی نے حیران ہو کر آواز لگائی: ''یہ تو 'اخرس' ہے۔''

''اخرس'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا معنی ہے: گونگا۔

''کیا کہا!؟'' لوگ یہ بات سن کر مزید حیران رہ گئے۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے! کوئی اخرس کیسے بول سکتا ہے!؟''

مکتب کے اساتذہ اور طلبہ حیران و پریشان کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ لگتا ہے اس اخرس کو ولایت مل گئی ہے، جو کرامتی طور پر بول اٹھا ہے۔

......☆......

یہ ان دنوں کی بات ہے جب بنواُمیہ کی سوسالہ حکومت ختم ہو گئی تھی اور بنوعباس اسلامی دنیا کے حکمران بنے تھے۔ بنوعباس کا پہلا خلیفہ ابوالعباس عبداللہ سفاح تھا۔ ابوالعباس عبداللہ سفاح نے اپنے ابتدائی دور میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا تھا۔ اس وقت اگرچہ ظلم و ستم کا بازار گرم تھا، مگر علمائے حق اپنی صلاحیتوں کو دین پھیلانے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ علمائے حق ہمیشہ ہی سے ہر دور میں ظلم کے خلاف دینِ حق کو پھیلانے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ اس دور میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ مرتب کیا تھا۔ اس کام میں اس وقت آپ کے لاکھوں شاگردوں میں سے نمایاں شاگردوں نے مدد فرمائی تھی۔ علم دین بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔

ایسے وقت میں شیطان نے بھی اللہ تعالیٰ سے کیے گئے اپنے وعدے: ''میں انھیں بہکاؤں گا۔'' (مفہوم آیت سورۂ حجر: ۳۹) کے مطابق انسانوں کو بہکانے کا کام تیز کر دیا۔

اس نے اسحاق نامی ایک شخص سے دوستی کی، تاکہ اسحاق، انسانوں کو جہنم میں لے جانے میں اس کی مدد کرے۔ اسحاق، شیطان کے جال میں آ گیا۔

اسحاق شمالی افریقہ کے ایک ملک الجزائر میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک سیدھا سادا سا مسلمان تھا، جو بکریاں پال کر گزر بسر کرتا تھا۔ اپنے بیٹے کی پیدائش پر وہ بہت خوش ہوا اور اُس کا نام اسحاق رکھا۔

اسحاق ابھی چھوٹا ہی تھا کہ اس کے والد نے اسے قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے مکتب میں داخل کروا دیا۔ اسحاق ایک ذہین بچہ تھا، سو اس نے جلد ہی کلام الٰہی کو حفظ کر لیا، یہی نہیں کہ اس نے کلام الٰہی حفظ کیا، بل کہ اس نے علم قراءت میں بھی مہارت حاصل کی۔

کلام الٰہی حفظ کرنے کے اور علم قراءت میں ملکہ حاصل کرنے بعد اُس نے دیگر آسمانی کتب کا بھی مطالعہ کیا۔ اس نے تورات، زبور اور انجیل میں بھی مہارت حاصل کی، پھر اُس نے مختلف زبانیں سیکھیں۔ یوں اس کی نوجوانی کی عمر آ گئی اور اسی عمر میں انسان عموماً بہک جاتا ہے۔

آج کل کے قادیانی بھی نوجوان مسلمانوں کو وَرغلاتے ہیں اور اُن کا ایمان چھین لیتے ہیں۔ سو اسحاق بھی بہک گیا اور اُس نے شیطان سے دوستی کر لی۔

علم حاصل کرنے کے بعد اُس نے سیر و تفریح شروع کر دی۔ وہ جس بھی علاقے میں جاتا وہاں کے لوگوں میں گھل مل جاتا۔ اس دوران میں اس نے علم حاصل کرنا بھی جاری رکھا۔

اس نے ظہورِ مہدی کے بارے میں روایات کا مطالعہ کیا، علمائے کرام سے اس موضوع پر گفتگو کی اور ظہورِ مہدی کے متعلق مزید علم میں اضافہ کیا، پھر اُس نے گزرے ہوئے جھوٹوں کے جھوٹے، یعنی نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کے متعلق معلومات حاصل کیں کہ انھوں نے دعویٰ نبوت کن حالات میں کیا اور اُن کا کیا انجام ہوا۔

یہ سب معلومات وہ اس لیے جمع کر رہا تھا، تاکہ گزرے ہوئے نبوت کے جھوٹے دعوے داروں سے کچھ سبق حاصل کرے اور اُن سے بہتر جھوٹا بن کر دکھائے، یعنی اس کا ارادہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کا تھا۔

اسحاق کی یادداشت بھی قدرتی طور پر بہت تیز تھی اور علم حاصل کرنے کے بعد اُسے دوسروں کو قائل کرنے کا فن بھی بہت عمدہ آ گیا تھا۔

اس نے سیاحت کے دوران میں ایران کے شہر اصفہان کا رُخ کیا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یہ شہر دوسرے شہروں کی نسبت پُرسکون تھا۔ یہاں پر ابوالعباس عبداللہ سفاح کا ظلم و ستم بھی نہیں تھا اور شہر اَمن کا گہوارا تھا۔

اسحاق چوں کہ ایک غلیظ کام، یعنی نبوت کے جھوٹے دعوے کا ارادہ کر چکا تھا، اس لیے اس نے اصفہان آ کر اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل طے کیا۔ اپنے اس ارادے کے لیے اس نے خود کو گونگا بنا لیا اور گونگا بن کر شہر میں گھومنے لگا۔

گونگے کو عربی میں اخرس کہتے ہیں، اسی نسبت سے اس کا نام اسحاق اخرس مشہور ہو گیا۔

......(جاری ہے)

بستے میں آم

اسد بخاری۔ لاہور

خرم سر جھکائے چُپ چاپ امی کو ڈانٹ سُن رہا تھا۔

امی کو نہ جانے کس نے آکر بتا دیا تھا کہ خرم نے ایک بوڑھے ریڑھی والے کے آم چوری کیے ہیں۔ امی نے اس کے اسکول کے بستے کی تلاشی لی تو چار بڑے بڑے آم بستے میں رکھے ہوئے تھے۔ اب تو امی نے پتا نہیں خرم کو کیا کیا بول دیا۔ وہ بالکل چُپ کھڑا تھا۔

امی نے کہا:

''اب تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ تمھاری زبان کند کیوں ہوگئی ہے؟ اب تمھیں بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔ آم چراتے ہوئے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اماں ابا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

خرم ہکلاتے ہوئے بولا:

''امی جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

امی نے اور غصے سے کہا:

''اچھا تو کسی غریب کے آم چُرا لینا تمھارے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

خرم نے جلدی سے اپنی صفائی میں کہا:

''نہیں امی! میں نے چوری نہیں کی۔''

امی نے طنزیہ کہا:

اچھا تو پھر یہ آم تمھارے بستے میں کیا کر رہے ہیں اگر تم نے چوری نہیں کی؟''

خرم نے امی کو سمجھانے کی کوشش کی:

''امی جان! آم میرے بستے میں ہیں، لیکن یہ میں نے چرائے نہیں ہیں۔''

امی نے فوراً کہا:

''اچھا تو اب تم آنکھوں دیکھی کو بھی جھوٹ کہو گے۔ تمھیں شرم آنی چاہیے خرم! جب محلے والوں کو معلوم ہوگا تو کیا جواب دوں گی میں، میں تو کسی کا سامنا نہیں کر سکتی اب۔''

خرم نے زچ ہوتے ہوئے کہا:

''امی! کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی غلط ہو جاتا ہے، آنکھیں بھی دھوکا کھا سکتی ہیں۔''

امی نے حیرت سے کہا:

''کیا کہا! ایک تو چوری، اوپر سے سینہ زوری، تمھیں شرمندہ ہونا چاہیے، پر تم تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہو۔ مجھے شرم آرہی تمھاری اس گھٹیا حرکت پر اور تم اپنی اس چوری کو آنکھوں کا دھوکا بول رہے ہو! واہ بیٹا! واہ!''

خرم نے کچھ کہنا چاہا تو امی نے فوراً ڈانٹ دیا اور کہا:

''بس کرو، مجھے تمھاری صفائی کی ضرورت نہیں ہے! زبان مت چلاؤ میرے سامنے۔''

یہ کہہ کر امی وہاں سے ناراض ہو کر چلی گئیں۔ خرم بے بسی سے بڑبڑایا:

''امی کو کیسے سمجھاؤں کہ میں نے چوری نہیں کی، بل کہ میں نے تو اُس بوڑھے ریڑھی والے کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔''

خرم افسردہ ہو کر وہیں بیٹھ گیا اور اپنے اسکول کے بستے کے قریب رکھے آموں کی طرف دیکھنے لگا، پھر اُس نے ان آموں کو دوبارہ اپنے

بستے میں رکھ دیا۔

شام کو خرم کے ابا دفتر سے آئے تو امی نے آتے ہی خرم کی یہ حرکت بتائی۔ ساری بات سننے کے بعد خرم کے ابا نے تسلی سے کہا:

''بیگم! آپ خواہ مخواہ دل میں شک کو جگہ دے رہی ہیں۔''

امی فوراً بولیں:

''آنکھوں سے دیکھنے کے بعد شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔''

خرم کے ابا، خرم کی امی کی عادت سے اچھی طرح واقف تھے کہ وہ کسی کی پوری بات کبھی نہیں سنتیں، بس خود ہی بولتی جاتی ہیں، اس لیے انھوں نے تصدیق کرنے کے لیے پوچھا:

''آپ نے خرم کی پوری بات سنی ہے؟''

امی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ساتھ ہی کہا:

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں خرم پر الزام لگا رہی ہوں؟ میں نے خود اس کے اسکول کے بستے سے چوری کیے ہوئے آم نکالے تھے۔''

ابو بولے:

''ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارا خرم ایسا بالکل نہیں ہے۔ آپ کو اس کی پوری بات سننی چاہیے تھی۔ مجھے یقین ہے کہ بات کچھ اور ہوگی۔''

امی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا:

''آپ تو ہمیشہ اسی کی طرف داری کرتے ہیں، میری بات پر تو یقین کرتے ہی نہیں ہیں، جب کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کبھی بھی غلط بات برداشت نہیں کرتی۔''

ابو نے کہا:

''میں بھی کبھی غلط بات کا ساتھ نہیں دیتا۔ اگر خرم نے غلطی کی ہوگی تو اُسے اس کی سزا ضرور ملے گی، اور جہاں تک لوگوں کی بات ہے تو وہ ایک کی چار بناتے ہیں۔''

دوسرے کمرے میں موجود خرم کو ساری باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے ہمت دکھائی اور ابو امی کمرے کے میں آ گیا۔ دونوں نے اُسے دیکھا۔

امی بولیں:

''خرم! تم چھپ کر ہماری باتیں سن رہے تھے؟''

خرم بولا:

''نہیں امی! یہ بالکل ویسے ہی ہے امی جان! جیسے میری نیت اُن آموں کو چُرانے کی نہیں تھی۔''

دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ابو نے کہا:

''کیا مطلب!؟ چُرانے کی نیت نہیں تھی؟ بیٹا! مجھے پوری بات بتاؤ۔ آخر بات کیا ہے؟''

خرم نے جلدی سے کہا:

''بابا! اسکول میں کچھ شرارتی بچے ہیں، جن کا کام ہی دوسرے لوگوں کو پریشان کرنا ہے۔ وہ ہر روز اسکول کے باہر کھڑے خوانچہ فروشوں کو پریشان کرتے ہیں اور اُن کی چیزیں اٹھا لیتے ہیں۔ جب کوئی کچھ بولتا ہے تو اُنھیں وہاں سے بھگانے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔''

امی نے اس کی طرف دیکھا اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی کہانی بنا رہا ہو خود کو بچانے کے لیے۔

خرم نے کہا:

''بابا! آج پہلی مرتبہ ایک بوڑھا ریڑھی والا آم لے کر وہاں کھڑا ہوا تو وہ لڑکے آم والے کو پریشان کرنے لگے۔ وہ چالاکی سے اس کے آم چھپا رہے تھے اور میں اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ جب مجھے موقع ملا تو میں نے ان سے وہ آم واپس لے لیے۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ کل اس بوڑھے ریڑھی والے کو واپس کر دوں گا، لیکن ان میں سے ایک کو پتا چل گیا۔ وہ امی کے پاس آ گیا اور اُلٹا مجھ پر چوری کا الزام لگا دیا۔

لیکن بابا! اُن سے آم واپس لیتے ہوئے میری نیت چوری کی نہیں تھی۔''

بابا نے امی کی طرف دیکھا اور کہا:

''دیکھا، ہمارا بیٹا جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور یہ چور بھی نہیں ہے، کم از کم آپ اس کی پوری بات تو سُن لیتیں۔''

امی نے شرمندگی سے نظریں جھکا لیں تو خرم نے کہا:

''امی! میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں ہے، لیکن آپ نے میری پوری بات ہی نہیں سنی۔''

امی ندامت بھرے لہجے میں بولیں:

''سوری بیٹا! میں نے تمھاری نیت پر شک کیا۔ جب میں نے چوری کا سُنا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا کہ میرا بیٹا چوری کر سکتا ہے!

تم نے ٹھیک کہا تھا بیٹا! کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی غلط ہو جاتا ہے، آنکھیں بھی دھوکا کھا سکتی ہیں۔ میرا بیٹا چور نہیں ہے۔''

بقیہ صفحہ نمبر 33 پر

شکر پارے

قارئین

☆ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ایک صاحب کو بہت دیر ہوگئی۔ ان کی کئی مرتبہ کوششوں کے بعد بہت تاخیر سے بیرا اُن کے پاس پہنچا اور بولا:

''جی جناب! آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟''

ان صاحب نے تحمل سے کہا:

''میں آیا تو ناشتا کرنے کے ارادے سے تھا، لیکن اب تو دوپہر کا کھانا ہی لے آؤ۔''

(حمزہ۔کراچی)

☆ دو بے وقوف دوستوں نے دو گھوڑے خریدے۔ چوں کہ دونوں ایک ہی نسل کے تھے، اس لیے مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ یہ کس طرح پتا چلے گا کہ کون سا گھوڑا کس کا ہے۔ ایک دوست بولا:

''یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میں اپنے گھوڑے کی دُم کاٹ دیتا ہوں، یہ نشانی رہے گی۔''

لہٰذا اُنھوں نے دونوں گھوڑے اکٹھے باندھے اور ایک کی دم کاٹ دی۔

صبح اٹھے تو پتا چلا کہ کسی ستم ظریف نے دوسرے کی دُم بھی کاٹ دی ہے۔

اب فیصلہ یہ کیا گیا کہ ایک گھوڑے کا کان کاٹ دیا جائے، مگر اگلی صبح دوسرے گھوڑے کا بھی کان کٹا ہوا تھا۔

دونوں بہت پریشان ہوئے۔ آخر کافی دیر سوچنے کے بعد ایک دوست نے ایک انتہائی حیرت انگیز حل تجویز کیا۔ اس نے کہا:

''ایسا کرتے ہیں کہ کالا گھوڑا تم لے لو اور سفید گھوڑا میں رکھ لیتا ہوں۔''

(رمیصاء عمر۔کراچی)

☆ ایک شخص کو چڑیا گھر میں نوکری مل گئی۔ نوکری یہ تھی کہ وہ مقررہ وقت پر چیتے کی کھال پہن کر چیتے کے پنجرے میں بیٹھ جائے۔ چیتے کے ساتھ والا پنجرہ شیر کا تھا۔ دونوں پنجروں کے درمیان ایک دروازہ تھا۔

ایک دن وہ دروازہ کھلا رہ گیا اور شیر، چیتے کے پنجرے میں آ گیا۔ چیتا نما شخص چلانے لگا:

''شیر! شیر!''

شیر چیتے نما شخص کے کان کے قریب اپنا منہ لا کر بولا:

''خاموش رہ! خود بھی نوکری سے جائے گا اور مجھے بھی نکلوائے گا۔''

(فرخ حسین۔سکھر)

☆ دو دوست اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں لاہور جانا تھا، مگر ریل گاڑی میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ انھیں ایک ترکیب سوجھی۔

انھوں نے شور مچا دیا کہ بوگی میں سانپ ہے۔

تمام مسافر خوف کے مارے ڈبے سے اتر گئے۔ دونوں دوست جلدی سے ڈبے میں سوار ہوئے اور برتھ پر سو گئے۔

جب ان کی آنکھ کھلی تو سامنے ایک قلی کھڑا تھا۔ انھوں اس سے پوچھا:

''بھائی صاحب! کیا لاہور آ گیا ہے؟''

قلی (حیرت سے): ''لاہور!؟ جناب! رات کو اِس ڈبے میں سانپ گھس آیا تھا، اس لیے یہ ڈبا ٹرین سے الگ کر دیا گیا تھا۔''

(باقر علی۔لودھراں)

☆ ایک شخص روٹی کا ایک ٹکڑا خود اور ایک ٹکڑا مرغی کو کھلا رہا تھا۔ دوست نے پوچھا:

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

اُس شخص نے جواب دیا:

''ہم خاندانی امیر لوگ ہیں۔ روز ''چکن'' کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں۔''

☆ ایک شخص کو راستے میں ایک ہزار کا نوٹ ملا، جس پر لکھا تھا: ''عید مبارک''!

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے بولا:

''خیر مبارک!''

(رقیہ ریحان۔اسلام آباد)

بادشاہ کون؟

بیگم ناجیہ شعیب احمد۔ کراچی

پیارے بچو!

جنگلستان کے گھنے اور اُونچے درختوں کے سائے تلے بڑے سے ہریالے میدان میں سارے چرندے (چرنے والے جانور) گول دائرہ بنائے پریشان بیٹھے تھے۔ ان چرندوں سے دُور درندوں (چیر پھاڑ کر کھانے والے جانور) کے مخبر لگڑ بھگے، گیدڑ اور لومڑ گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے ان چرندوں کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

.....☆.....

زونو بارہ سنگھا بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے ننھے سے سر کو فکر مندی سے ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا:

''جنگلستان کی دنیا کتنی بے رحم ہے! یہ سارے درندے آخر مر کیوں نہیں جاتے۔ پتا نہیں میرے نوکیلے سینگ کب نکلیں گے؟ تاکہ میں ان کی مدد سے ان ظالم اور بے رحم درندوں کے پیٹ پھاڑ سکوں۔''

ٹومبا گینڈا بولا:

''اب تو میں بھی شیر کو جنگلستان کا بادشاہ نہیں مانتا۔ بادشاہ تو رحم دل ہوتا ہے، جو اپنی رعایا کا خیال رکھتا ہے۔ یہ کیسا بادشاہ ہے جو ہم معصوم جانوروں کو ہراساں کرنے اور چیر پھاڑ کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اپنی طاقت کے بل پر روز ہمارا بے دریغ شکار کرتا ہے۔''

شابو پانڈا بولا:

''ہمیں جنگلستان میں خون خوار شیر کا اندھا راج نامنظور ہے۔ ہم جانتے ہیں قانونِ قدرت، مگر ہم بھلا بھوک سے زیادہ کھانا کھانے والے کو بھوکا کیسے کہہ دیں؟ یہ تو حرص ہے اور حریص کا پیٹ کبھی بھی نہیں بھرتا۔''

گوشو خرگوش بولا:

''ہاں ہاں، شابو پانڈا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، میرا پیٹ تو تھوڑا سا کھاتے ہی بھر جاتا ہے۔''

گوشو خرگوش نے اپنی ننھے منے سے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو زونو کی ہنسی نکل گئی۔

.....☆.....

زونو ایک بارہ سنگھا ہے جس نے صدیوں سے رائج جنگلستان کے قانون کے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت کی ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟

اسے اچھی طرح یاد ہے، جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تب اس کے بابا بارہ سنگھے نے اسے شیر اور اُس کے خوں خوار ساتھیوں کی مکاریوں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بابا بارہ سنگھا، زونو کو آزادی اور بے فکری سے قلانچیں بھرنے اور کھیلنے کودنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔ انھیں ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں زونو شکار نہ کر لیا جائے۔ اس کے بہادر بابا کے نوکیلے سینگوں سے تمام درندے خوف کھاتے تھے اور اُن سے دور دُور رہتے

تھے۔ آہ! مگر کب تک! ایک دن اسے بچاتے بچاتے اس کے بابا خود شیر کا شکار بن گئے۔

بابا بارہ سنگھے کی آنکھیں بند ہوتے ہی جنگلستان میں خوں خوار اور بے رحم درندوں کا اندھا راج قائم ہوگیا۔ جس درندے کا جب جی چاہتا وہ معصوم جانوروں کو چیر پھاڑ ڈالتا۔ تب سے جنگلستان کے بے بس اور لاچار جانوروں کے اندر نفرت اور اشتعال کی آگ بھڑکتی چلی گئی۔

زونو کو شیر کی بادشاہت پر سخت اعتراض تھا۔ وہ کسی صورت بھی شیر کو بادشاہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے حامیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی بنانے میں کام یاب ہوگیا تھا، جس میں دن بدن اضافہ شیر اور دوسرے درندوں کو تشویش میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس تشویش ناک صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے دانا جانوروں کے کہنے پر جنگلستان میں ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا، جس میں زونو بارہ سنگھے کو تمام کمزور اور ڈرپوک جانوروں نے خوب گھر کا اور اپنا مؤقف بدلنے پر مجبور کیا، مگر بہادر بارہ سنگھے کا بیٹا زونو اپنی بات پر اَڑا رہا، ذرہ برابر ٹس سے مس نہ ہوا۔

ڈرپوک زرافہ بولا:

''زونو! آخر تمھیں شیر سے کیا خار ہے؟ وہ رعب دار، پُرہیبت دھاڑ اور خطرناک جسامت کا مالک ہے۔ سب جانور اُس سے ڈرتے ہیں۔''

رمبا ریچھ بولا:

''بے شک جنگلستان کا بے تاج بادشاہ کہلانے کا اصلی حق دار شیر ہی ہے۔''

زیم زیبرا بولا:

''رمبا! تم اتنے لمبے بالوں اور نوکیلے پنجوں کے مالک ہو کہ شیر اور اُس کے ساتھی تم پر حملہ کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ہم جیسے کمزوروں کا کیا بنے گا؟''

شابو پانڈا بولا:

''پھر ہم کیوں زندہ رہنے کی تمنا کریں؟ جب کہ ایک نہ ایک دن اچانک کسی ظالم خوں خوار درندے نے ہمیں چیر پھاڑ ڈالنا ہے۔''

رمبا ریچھ بولا:

''قانونِ قدرت یہی ہے کہ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک دن مرنا بھی ہے۔ باقی بس ایک اللہ بادشاہ کا راج رہ جانے والا ہے۔''

زیم زیبرا بولا:

''تو آخر جنگلستان کی بادشاہت کسے سونپی جائے؟''

سب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

زیم زیبرا، گوشو خرگوش، زونو بارہ سنگھا اور شابو پانڈا ایک ساتھ بول اٹھے:

''ہاتھی، ہم سب کا ساتھی! ذرا دیکھو تو کتنا بھاری بھرکم ڈیل ڈول والا ہے۔ کیا زبردست چال ہے، اس پر اِنکساری کا عالم یہ کہ گھانس پھونس کھا کر ہمیشہ شکر کا کلمہ پڑھتا ہے۔''

رمبا ریچھ بولا:

''ہمم.....! ایسا ہوسکتا ہے، مگر حتمی طور پر ہاتھی کی بادشاہی کا فیصلہ تمام چھوٹے بڑے جانور مل کر ہی کریں گے۔''

زیم زیبرا بولا:

شیر کو آزمانے کے بعد ہاتھی کی بادشاہت قبول کرنے میں کوئی ہرج نہیں، اسے بھی آزما کر دیکھ لیں۔ ویسے بھی سب حکمران ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

ٹومبا گینڈا بولا:

''مگر مجھے ہرگز قبول نہیں۔ جنگلستان کسی شیر یا ہاتھی کی ذاتی جاگیر نہیں ہے۔ یہاں کے بادشاہ ہم خود ہیں، اپنا قانون ہم خود بنائیں گے اور اپنی مرضی چلائیں گے۔''

رمبا ریچھ کڑک دار آواز میں بولا:

''خاموش! انسانوں کی طرح بحث کرنا بند کرو۔ جنگل میں رہنے کے کچھ اصول وضوابط ہیں۔ ایک بادشاہ کا ہونا ضروری ہے، تاکہ تمام چھوٹے بڑے جانور، بادشاہ کی ماتحتی میں رہ کر جنگلستان کے قوانین کی پاس داری کریں۔''

آخر کار شیر سے بے زار جانوروں نے ہاتھی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

.....☆.....

ہاتھی کے بادشاہ بننے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہاتھی نے جنگلستان کی باگ ڈور سنبھالتے ہی فوراً شیر کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔

شیر اور اُس کے ساتھی درندوں نے غرور اور گھمنڈ میں آکر جنگل میں دنگل مچا دیا۔

ہاتھی نے بھی شیر اور اُس کے ساتھیوں پر دھاوا بول دیا۔ گھمنڈی شیر کی ساری اکڑفوں ہوا ہوگئی۔ وہ ہاتھی سے رحم کی درخواست کرنے لگا، مگر جانوروں کی قیمتی جانوں کے نقصان کا خیال آتے ہی ہاتھی نے خونی مغرور درندے کا سَر اپنے بھاری بھرکم پیر سے کچل کر رکھ دیا۔

یوں جنگلستان سے ظلم کا راج ختم ہوگیا اور اَمن کا دور دورہ ہوگیا۔

پورے چاند کی رات

حمیرا علیم۔ کوئٹہ

''نانو، نانو! دیکھیں نا ساجد ماموں مجھے آئس کریم کھلانے نہیں لے جا رہے۔ کہتے ہیں: روزہ کھلنے والا ہے، اس لیے مغرب کی نماز کی بعد چلیں گے۔ مجھے ابھی آئس کریم کھانی ہے۔'' مقداد نے نانو سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ''اب بھلا یہ کیا بات ہوئی! مارچ میں کون سا رمضان ہے جو ماموں نے روزہ رکھا ہوا ہے؟''

''ادھر آؤ میرے پیارے بیٹے! اگر ماموں کہہ رہے ہیں تو یقیناً نماز پڑھ کر وہ لے جائیں گے نا آپ کو، پھر پریشانی کیا ہے؟'' نانو نے پیار سے اپنے آٹھ سال کے نواسے کو دیکھا جو آج کل ان کے گھر رہنے کے لیے آیا ہوا تھا اور جو سب سے چھوٹے ماموں ساجد کا لاڈلا تھا۔

''پر انھوں نے روزہ رکھا کیوں ہے؟ بتائیں نا! آپ نے اور وہب ماموں، جویریہ ممانی اور ہالہ خالہ نے بھی روزہ رکھا ہوا ہے۔ اب میں کیا کروں؟'' مقداد سخت بور ہو رہا تھا۔

''اچھا تو جناب کو یہ مسئلہ ہے کہ سب نے روزہ کیوں رکھا ہے۔ آؤ میں تمھیں بتاتی ہوں۔'' نانو نے مقداد کو اپنے ساتھ بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر ماہ کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں کو روزہ رکھنا۔''

اور چوں کہ ہر نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ملتا ہے تو اگر ہم ہر ماہ تین دن روزے رکھیں گے تو ہمیں پورے تیس (30) روزوں کا ثواب مل جائے گا۔ ہے نا مزے کی بات! بس اسی لیے ہم سب گھر والے ان تین دنوں میں روزہ رکھتے ہیں۔''

''مگر صرف انھی تین دنوں میں کیوں؟ ہم کوئی سے بھی تین دن روزہ کیوں نہیں رکھ سکتے نانو!؟'' مقداد نے پوچھا۔

''سوال تو اچھا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ کہ جب اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کسی چیز کا حکم دیں تو ہم پر فرض ہے کہ ہم بغیر کسی سوال کے وہ کام کر لیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان دنوں کو ایام بیض کہتے ہیں۔'' مقداد نے نانو کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا:

''اب یہ ایام بیض کیا ہے؟''

''اوہو بھئی، میں تو بھول ہی گئی کہ آپ لوگ سائنس انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ تم نے سائنس کی کتاب میں tidal change کے بارے میں پڑھا ہوگا، جب سمندر کی لہروں میں مدوجزر، یعنی tidal change پیدا ہوتا ہے تو اُس کی کیا وجہ ہوتی ہے؟ معلوم ہے نا!'' نانو نے پوچھا۔

''جی ہاں، جب پورا چاند ہوتا ہے تو اُس کی کشش سمندر کی لہروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے، جس سے لہریں چاند کی سمت بڑھتی ہیں اور لہروں میں جوار بھاٹا پیدا ہو جاتا ہے۔'' مقداد نے جھٹ سے قابلیت جھاڑی۔

''ماشاء اللہ! میرے بیٹے کو تو سب پتا ہے۔ ہاں جی، یہ جوار بھاٹا، پورے چاند کی راتوں میں ہوتا ہے اور انھی راتوں کو ایام بیض کہتے ہیں، یعنی ''سفید دن''۔ کبھی دیکھا ہے جب پورا چاند ہوتا ہے تو کیسے ہر طرف سفید سفید چاندنی پھیلی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان دنوں کو سفید دن کہا جاتا ہے، پھر جس طرح سمندر کی لہروں میں چاند کی کشش کی وجہ سے اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے ویسے ہی انسان اور جانور بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ تو انسانوں کو چاند کی کشش کے اثرات سے بچانے کے لیے ہمیں حکم دیا گیا کہ ان تین دنوں میں روزہ رکھیں۔ آیا سمجھ؟'' نانو نے پوچھا۔

''سمجھ میں تو آ گیا، مگر روزہ کیسے ہمیں بچا سکتا ہے؟'' مقداد نے اُلجھن سے کہا۔

''دیکھو، جب ہم روزہ رکھتے ہیں نا تو ہر غلط کام چھوڑ دیتے ہیں۔ بھوکا رہنے سے ہمارے ہارمونز کا لیول بھی مناسب رہتا ہے، اسی طرح دماغ میں الٹے سیدھے خیالات بھی نہیں آتے اور ہم کسی بھی گناہ سے بھی محفوظ رہتے ہیں، اسی لیے نبی ﷺ کی بہت سی احادیث میں ان دنوں کے روزوں کا ذکر ہے، لہٰذا روزے رکھنے سے نہ صرف ہم کسی بھی بیماری سے محفوظ رہتے ہیں، بل کہ ہمیں ثواب بھی کتنا ملتا ہے! صرف تین روزے ایک مہینے میں، چھتیس پورے سال میں اور ثواب پورے ۳۶۰ دنوں کا، یعنی پورے سال کے روزوں کا، سبحان اللہ!'' نانو نے کہا۔

''واہ! نانو! اتنا ثواب! میں بھی اب روزہ رکھوں گا۔'' مقداد نے متاثر ہو کر کہا۔

''بیٹا! جب آپ تھوڑے اور بڑے ہو جائیں گے تو پھر آپ بھی یہ روزے رکھیے گا۔ اچھا اب کیا پروگرام ہے؟ آئس کریم ابھی کھانی ہے یا مغرب کی بعد؟'' نانو نے مقداد کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں، وہ تو سائب ماموں کے ساتھ نماز پڑھ کر ہی کھانے جاؤں گا۔ ابھی تو میں خالہ کی مدد کرنے باورچی خانے میں جا رہا ہوں، تاکہ افطاری بنانے کا کچھ ثواب مجھے بھی تو ملے۔'' مقداد نے بستر سے چھلانگ لگا کر اُترتے ہوئے کہا اور نانو مسکرا دیں۔

تیز پات

سعد علی چھیپا۔ کراچی

تیز پات جسے تیز پتے بھی کہا جاتا ہے، ایشائی ممالک میں عام طور پر کھانوں میں محض خوش بو اور ذائقے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جب کہ ماہرین کا کہنا ہے کہ تیز پات ذہنی تناؤ کم کرنے سمیت دیگر بیماریوں میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

غذائی و طبی ماہرین کی جانب سے تیز پات کے بے شمار فوائد گنوائے جاتے ہیں، جب کہ ماہرین جڑی بوٹیوں کے مطابق کھانوں میں استعمال کیے جانے والا تیز پات ایک دوا کی طرح صحت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس میں کچھ ایسے قدرتی اجزا پائے جاتے ہیں جو دماغ کو پُرسکون رہنے میں مدد فراہم کرتے ہیں، جب کہ تیز پات سانس لینے میں دشواری جیسی شکایت بھی دور کرتا ہے۔

تیز پات کے فوائد:

☆ تیز پات جوڑوں کے درد میں آرام پہنچانے کے علاوہ سر درد اور بے چینی کی کیفیت ختم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

☆ تیز پات قوت مدافعت کو مضبوط کرتا ہے۔

☆ تیز پات دماغی صلاحیت کو بھی تیز کرتا ہے۔

☆ تیز پات جلانے سے مچھر بھاگ جاتے ہیں۔

☆ تیز پات میں وٹامن سی کی بھاری مقدار پائی جاتی ہے۔

☆ تیز پات سے گرتے بالوں کا علاج بھی ممکن ہے۔

☆ تیز پات زخموں کو بھی بہت کم وقت میں ٹھیک کر دیتا ہے۔

☆ تیز پتے کے ذریعے معدے کی بیماریوں کا علاج کیا جاسکتا ہے۔

☆ تیز پات سردی کے اثرات سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

☆ تیز پات نہ صرف مثانے کے نظام کو بہتر بناتا ہے، بل کہ مثانے اور گردے کی پتھری کا علاج بھی کرتا۔ تیز پات کی ایسیڈک خصوصیت سے پتھری ٹوٹ جاتی ہے اور اُسے جسم سے قدرتی طور پر نکلنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ تیز پتے کا تیل الرجی، جلد کے امراض اور چہرے پر دانوں کے لیے کافی مددگار ہے۔

☆ تیز پات ہمارے مدافعتی نظام کی حفاظت کرتا ہے اور ہمیں پُرسکون زندگی بخشتا ہے۔

☆ تیز پات کو کسی برتن میں رکھ کر جلانے اور دھونی دینے کے نتیجے میں انسان انتہائی پُرسکون نیند سو سکتا ہے، یہ ٹوٹکا خصوصاً دمے کے مریضوں کے لیے بے حد مفید ہے۔

☆ ذیابیطس کا علاج بھی تیز پات کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ خون میں موجود گلوکوز کی سطح میں کمی واقع کرتا ہے۔ اس کے علاوہ خراب کولیسٹرول اور چربی میں بھی کمی لاتا ہے۔

☆ یرقان میں آپ کا جگر دباؤ کا شکار ہوتا ہے، لیکن تیز پات کا استعمال جگر کو اِس دباؤ سے بچاتا ہے۔

تمام قارئین کرام سے مؤدبانہ عرض ہے کہ کسی بھی چیز کے فوائد پڑھ کر اسے زیادہ نہ کھائیں، بل کہ اس کا استعمال اعتدال سے کریں اور اگر آپ کو کوئی خاص بیماری ہے تو اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کوئی بھی غذا استعمال کریں۔

شکریہ بھیا!

عاطر شاہین۔ملتان

''بھیا..... بھیا!''

آٹھ سالہ فاطمہ کافی دیر سے اپنے تین سال بڑے بھائی سفیان کو پکار رہی تھی، لیکن سفیان اسے جواب دینے کی بجائے اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے فاطمہ کی آواز سُنی ہی نہ ہو۔

''بھیا..... بھیا!''

اگلی مرتبہ پکارنے پر بھی سفیان نے کوئی جواب نہ دیا تو بالآخر فاطمہ مایوس سا چہرہ لیے اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ عین اسی لمحے باورچی خانے سے نکلتی امی کی نظر فاطمہ پر پڑی تو وہ چونک اٹھیں۔

''فاطمہ! ادھر آؤ۔'' امی نے اسے آواز دی تو وہ امی کے پاس چلی گئی۔

''کیا بات ہے فاطمہ! یہ تم نے منہ کیوں بنایا ہوا ہے؟'' امی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''امی! بھیا مجھ سے بات ہی نہیں کر رہے۔'' فاطمہ نے اپنے منہ بنانے کی وجہ بتائی۔

''کیوں؟ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟'' امی نے پوچھا، لیکن فاطمہ نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ سمجھ گئیں کہ فاطمہ نے یقیناً بڑے بھائی سے بدتمیزی کی ہے، جس کی وجہ سے سفیان اس سے ناراض ہو گیا ہے۔

''یقیناً تم نے بھیا سے بدتمیزی کی ہوگی۔'' امی نے کہا۔ ''ایسا ہی ہے نا!؟''

''جی امی!'' فاطمہ نے نظریں جھکاتے ہوئے شرمندہ لہجے میں جواب دیا۔

''میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ بڑے بھائی سے بدتمیزی نہیں کرتے، لیکن تم میری بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی ہو۔'' امی نے کہا۔

''امی! آئندہ بھیا سے بدتمیزی نہیں کروں گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں سفیان سے بات کرتی ہوں۔'' امی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، پھر وہ سفیان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

سفیان کا واقعی موڈ بگڑا ہوا تھا۔ آج صبح ہی دونوں بہن بھائی میں نوک جھونک ہوئی تھی۔ اسی دوران میں فاطمہ نے سفیان سے بدتمیزی کی تھی تو اُسے غصہ آ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فاطمہ کو منع کر دیا تھا کہ وہ اس سے بات نہ کیا کرے اور نہ ہی وہ اسے دکان سے چیز لا کر دیا کرے گا۔ فاطمہ چیز ہی کھانا چاہتی تھی، اسی لیے وہ سفیان کے پاس گئی تھی، لیکن اس کے جواب نہ دینے پر وہ مایوس ہو کر چلی گئی تھی۔

امی سفیان کے کمرے میں گئیں تو وہ کرسی پر بیٹھا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ آہٹ پر اُس نے چونک کر اُمی کو دیکھا اور پھر اُن کے احترام میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''امی! آپ!''

''سفیان!'' امی نے کہا۔ ''بیٹا! کیوں چھوٹی بہن سے ناراض ہو؟''

''امی، آپ جانتی تو ہیں کہ وہ ہر وقت مجھ سے بدتمیزی کرتی رہتی ہے۔'' سفیان نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''پچھلے اتوار کو اُس نے رابعہ اور اَحمد (کزنز) کے سامنے بھی میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ مجھ سے اس کی بدتمیزی برداشت نہیں ہوتی۔''

''اچھا، آؤ، ادھر بیٹھو۔'' امی نے نرم لہجے میں کہا اور پھر وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تو امی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں:

''دیکھو بیٹا! میں مانتی ہوں کہ فاطمہ نے تم سے بدتمیزی کی ہے، لیکن اس سے پہلے قصوروار تم ہو۔''

''میں..... میں کیسے امی!؟'' سفیان کو حیرت ہوئی۔

''دیکھو بیٹا! صبح جب فاطمہ سے تمھارا جھگڑا ہوا تو تم نے بدتمیزی سے بات کرنے میں پہل کی تھی۔'' امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات یاد رکھو، چھوٹے ہمیشہ بڑوں سے سیکھتے ہیں۔ جب بڑے ہی بدتمیزی کا رویہ اختیار کریں گے تو چھوٹے بھی انھی سے سیکھ کر ویسا ہی رویہ اختیار کریں گے۔

دوسری بات، فاطمہ تمھاری چھوٹی بہن ہے۔ اگر وہ تم سے بدتمیزی کرتی ہے تو تم درگزر کرو۔ جب تم درگزر کرو گے تو وہ بھی تم سے بدتمیزی نہیں کرے گی۔ وہ بھی سوچے گی کہ جب میرے بھیا میرے ساتھ بدتمیزی سے بات نہیں کرتے، مجھ سے اچھے طریقے سے پیش آتے ہیں تو میں کیوں ان کے ساتھ بدتمیزی کروں۔ کیا میری بات سمجھ رہے ہو؟''

سفیان کچھ دیر سوچتا رہا، امی کی بات سو فی صد درست تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا: ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی! میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔''

''کیا سمجھ گئے ہو، مجھے بھی بتاؤ؟'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''امی! چھوٹے ہمیشہ بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں۔ میں بھی بدتمیزی سے بات کرتا ہوں، اس لیے وہ مجھ سے سیکھ رہی ہے، لیکن اب میں عہد کرتا ہوں کہ میں آئندہ فاطمہ کو نہیں ڈانٹوں گا اور نہ ہی اس سے بدتمیزی سے بات کروں گا۔

اگر وہ مجھ سے بدتمیزی کرے گی تو میں اس کی غلطی سے درگزر کروں گا، اسے سمجھاؤں گا اور اچھے طریقے سے پیش آؤں گا۔ اس طرح وہ میرے رویے سے خود ہی ٹھیک ہو جائے گی اور مجھ سے بدتمیزی نہیں کرے گی۔''

''بالکل ٹھیک! شاباش!'' امی خوش ہو گئیں۔

اسی لمحے فاطمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بولی:

''بھیا! اب تو آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں نا!؟''

سفیان مسکرایا: ''نہیں!''

''شکریہ بھیا!'' فاطمہ خوش ہو گئی۔ ''بھیا! میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی بھی آپ سے بدتمیزی نہیں کروں گی۔ میں معذرت کرتی ہوں۔''

اس کی بات پر امی اور سفیان، دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ امی خوش ہو گئی تھیں کہ سفیان ان کی بات سمجھ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے فاطمہ!'' سفیان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوم ورک کر لوں، پھر تمھیں چیز لا دیتا ہوں۔''

''شکریہ بھیا!'' فاطمہ نے کہا تو امی نے ان دونوں کو گلے سے لگا لیا۔

بقیہ: بستے میں آم

بابا نے شرارت سے کہا:

''ہاں، ہاں! یہ تو واضح ہو گیا۔ اب اُن چار آموں کا کیا کرنا ہے؟ ہم تو تین ہیں۔''

امی نے فوراً کہا:

''کیا مطلب! ہم تین ہیں؟''

ابا نے لچاتے لہجے میں کہا:

''وہ..... میرا تو دِل چاہ رہا ہے آم کھانے کا۔''

امی جھٹ سے بولیں:

''یہ آم واپس جائیں گے، کسی کی امانت ہیں۔ ہاں، کھانے کا دِل چاہ رہا ہے تو اس ریڑھی والے سے خرید کر کھائیں گے، اس طرح اس کی مدد بھی ہو جائے گی۔''

بابا نے منہ بسورتے ہوئے کہا:

''ہماری قسمت میں تو مفتا (مفت) ہے ہی نہیں۔''

بابا کی بات سن کر خرم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

امی نے خرم کی طرف دیکھا اور اُس کے قریب آ کر کے گالوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے پچکارتے ہوئے کہا:

''شاباش بیٹا! دوسروں کا احساس کرنا ہی اصل زندگی ہے۔''

امی کی آنکھوں میں خرم کے لیے محبت کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ امی نے جلدی سے خرم کو گلے لگا لیا اور پیار کرنے لگیں۔

ابو یہ دیکھ کر مسکرانے لگے۔

ذوقِ معلومات (۷۲) کا درست جواب

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام (آپ علیہ السلام پر آسمانی کتاب ''تورات'' نازل ہوئی تھی)

آپ علیہ السلام کے بھائی کا نام حضرت ہارون علیہ السلام تھا، جو آپ علیہ السلام سے عمر میں تین سال بڑے تھے۔

مسلمان کیسے ہوا؟

محمد حذیفہ رفیق زم زمی۔ کراچی

ہر طرف فتنوں کا سیلاب ہے۔ کہیں کوئی مرتد ہو رہا ہے، کہیں کوئی زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہا ہے اور کہیں کسی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر لیا ہے اور لوگ اسے نبی مان رہے ہیں۔

روم اور فارس تو کفر کے مراکز اور باطل کے اڈے تھے، لیکن حجازِ مقدس کی زمین کو تو نبی کریم ﷺ نے اپنے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے خون سے سیراب کیا تھا اور وہاں ایمان کی بہار آئی تھی، اسلام کے پھول کھلے تھے، لیکن اب حرمین شریفین کے علاوہ چند ایک علاقے ہی محفوظ تھے۔ باقی ہر طرف ارتداد کی خزاں کا ڈیرہ تھا، یعنی لوگ دینِ اسلام کو چھوڑے چلے جا رہے تھے اور دوبارہ اپنے پچھلے مذہب کی طرف لوٹ رہے تھے۔

اس سیلاب کے سامنے ایک ہی آدمی آہنی دیوار کی مانند کھڑا ہوا تھا، جسے ایک ہی فکر دامن گیر تھی کہ اللہ تعالیٰ کا دین سربلند ہو جائے، اسی کے لیے اس نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان تمام فتنوں کے خاتمے کے لیے متعدد لشکر روانہ فرمائے۔ بحرین میں مرتدین کے خلاف جنگ کے لیے حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں لشکر روانہ فرمایا۔

لشکر بحرین کی طرف رواں دواں تھا۔ راستے میں بنو حنیفہ قبیلے کے سردار ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ بھی اپنے قبیلے سمیت لشکر کے ساتھ مل گئے، اور بھی کچھ قبائل لشکر کے ساتھ شامل ہوتے چلے گئے۔

حضرت علاء رضی اللہ عنہ ایک صحرائی راستے ''دھنا'' سے گزر رہے تھے۔ بیچ میں رات آ گئی۔ ارادہ یہ تھا کہ یہیں پڑاؤ ڈالیں گے۔ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک تمام لشکر کے اونٹ سامان سمیت ایک سمت میں بھاگنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ سب ہی حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ مصیبت در مصیبت یہ تھی کہ پورے لشکر کا تمام تر ساز و سامان انھی اونٹوں پر تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا لوگوں کی پریشانی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہوتے ہوتے بے چینی اور اضطراب کا یہ حال ہو گیا کہ لوگ اپنی زندگی سے مایوس ہونے لگے، یہاں تک کہ ایک دوسرے کو وصیت کرنے لگے۔

حضرت علاء رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کی یہ حالت دیکھی تو اُن سب کو جمع کیا اور اُن سے فرمایا:

''یہ تم لوگوں نے پریشانی کو اس قدر اپنے اوپر سوار کیوں کر لیا ہے؟''

انھوں نے کہا:

''آخر ایسے وقت میں ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟ بس کل صبح کا سورج چڑھے گا اور ہم جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

حضرت علاء رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ہرگز نہیں! تم تو مسلمان ہو، اللہ کے راستے میں ہو، اللہ کے دین کے مددگار ہو، پُرامید رہو۔ اللہ کی قسم! تم ہرگز بے یار و مددگار نہیں چھوڑے جاؤ گے۔''

اگلی صبح فجر کی نماز کے بعد حضرت علاء رضی اللہ عنہ نے دعا مانگنا شروع فرمائی۔ پورا لشکر بھی ساتھ دعا مانگنے لگا۔ ابھی دعا مانگ ہی رہے تھے کہ دور سے زمین چمکتی ہوئی نظر آئی۔ وہ سب اس طرف کو بڑھے۔ وہاں پانی کا چشمہ تھا۔ سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ پانی پیا اور غسل کیا۔ سورج چڑھتے

ہی چاروں طرف سے اونٹ آنا شروع ہوگئے، یہاں تک کہ سارے اونٹ جمع ہوگئے۔ انھوں نے اونٹوں کو بھی پانی پلایا اور سیراب کیا۔ لشکر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

کچھ آگے چلنے کے بعد اُنھوں نے ایک ساتھی منجاب بن راشد سے کہا:

’’جس جگہ ہمیں پانی کا چشمہ ملا تھا وہ جگہ تمھیں یاد ہے؟‘‘

انھوں نے کہا: ’’بالکل!‘‘

فرمایا: ’’بس پھر مجھے وہیں لے چلو۔‘‘

منجاب بن راشد اُنھیں ایک جگہ لے کر گئے۔ وہاں پانی کے چند آثار کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

منجاب کہنے لگے: ’’جگہ تو یہی ہے، لیکن چشمہ نجانے کہاں گیا؟‘‘

اتنے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایک کونے میں ایک مشکیزہ نظر آ گیا۔ مشکیزہ دیکھتے ہی انھوں نے زور سے کہا: ’’یہی جگہ ہے۔‘‘

پھر منجاب فرمانے لگے:

’’میں نے یہاں سے چلتے وقت ایک مشکیزہ بھر کر تالاب کے کنارے چھوڑ دیا تھا، تاکہ میں دیکھوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے یا کوئی چشمہ ہی ہے۔ اب پتا چلا کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا۔‘‘

اس کے بعد حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ آگے بڑھنے لگے، یہاں تک کہ دشمن کشتیوں پر سوار ہو کر دریا پار چلا گیا۔ یہ بحرین کا ایک علاقہ ’’دارین‘‘ تھا۔

کشتیوں میں سمندر کے راستے دارین تک کا سفر ایک دن اور ایک رات (چوبیس گھنٹے) کا تھا، جب کہ حضرت علاء رضی اللہ عنہ کم وقت میں دشمن تک پہنچنا چاہتے تھے، دیر ہونے کی صورت میں دشمن بہت دور تک نکل سکتا تھا، چناں چہ دریا کے سامنے پہنچ کر حضرت علاء رضی اللہ عنہ نے لشکر سے فرمایا:

’’اللہ تعالیٰ نے تمھیں خشکی میں اپنی نشانیاں دکھائی ہیں، تاکہ تم آگے بڑھ کر سمندر میں بھی اس کی قدرت کے کرشمے دیکھ لو، لہٰذا اب آگے بڑھو اور دریا کو عبور کرو۔‘‘ پھر حضرت علاء رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ کہے:

’’یا ارحم الراحمین، یا کریم، یا حلیم، یا صمد، یا حی، یا محیی الموتی، یا حی یا قیوم، لا الٰہ الا انت، یا ربنا!‘‘

یہ کہہ کر خود گھوڑے سمیت دریا پر چلے گئے اور پیچھے پورا لشکر، اونٹ، گھوڑے اور پیدل لشکر، سب چل پڑے۔ وہ دریا پر اِس طرح چل رہے تھے جیسے ریت پر چل رہے ہوں۔

دشمن نے انھیں آتے ہوئے دیکھا تو بدحواس ہو کر بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے عین موقع پر پہنچ کر حملہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور کفار اور مشرکین کو شکست ہوئی۔ بہت سے دشمن قتل ہوئے اور بہت سے قید ہوئے۔ غنیمت کا کافی مال بھی ہاتھ آیا اور دوبارہ وہاں اسلام کا پرچم بلند ہوا۔ حضرت علاء رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت فتح کی خوش خبری کے ساتھ امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو روانہ فرما دیا۔

اس لشکر میں مسلمانوں کے ساتھ ایک عیسائی پادری (راہب) بھی تھا۔ وہ مسلمان ہوگیا۔ اس سے اسلام لانے کی وجہ پوچھی گئی تو اُس نے کہا:

میں نے یہاں تین چیزیں دیکھی ہیں، مجھے خوف ہے کہ اگر اُن نشانیوں کو دیکھنے کے بعد بھی میں اسلام نہیں لایا تو اللہ تعالیٰ میرا چہرہ مسخ نہ فرما دے۔

۱۔ صحرا میں پانی کا چشمہ۔ ۲۔ دریا میں راستے۔ ۳۔ میں لشکر میں رات کو بوقت سحر غیب سے یہ آواز سنتا تھا:

اللھم انت الرحمن الرحیم. لا الٰہ غیرك۔

مجھے یقین ہوگیا کہ یہ فرشتے ہیں، اور فرشتے اسی قوم کی مدد کے لیے اترتے ہیں جو حق پر ہوتے ہیں۔

(الکامل لابن الاثیر، ۲/۲۲۱، ۲۲۵، دار الکتاب العربی)

بقیہ: صحرا کا بھوت

آگے ڈھلوان شروع ہو رہی تھی، میں جیسے ہی اس سے اترا تو نیچے پھسلتا چلا گیا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ آگے کیچڑ ہوگا۔

چوں کہ صحرائی علاقہ ختم ہو چکا تھا، اس لیے آگے کافی پھسلن تھی اور جگہ جگہ پانی کے جوہڑ بنے ہوئے تھے۔ میں نے کلہاڑی کا سہارا لیا اور گرنے سے بچ گیا۔

اب میں شہر میں داخل ہو چکا تھا اور گھر کے کافی نزدیک آ چکا تھا۔ جب میں گھر کے قریب موجود مسجد تک پہنچا تو ابا جان اور میرا ایک کزن مجھے ڈھونڈنے کے لیے نکل رہے تھے۔ اس وقت تک رات کافی ہو چکی تھی اور میں بھیگنے کی وجہ سے مسلسل کانپ رہا تھا۔

ابا جان نے بتایا کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے میں کھیتوں کی طرف نہیں گیا تھا اور سیدھا گھر آ گیا تھا۔ گھر پہنچ کر اُنھوں نے کافی دیر میرا انتظار کیا، لیکن جب عشا کی نماز کے بعد بھی میں گھر نہ پہنچا تو وہ میرے پیچھے روانہ ہونے والے تھے۔

اس دن کے بعد سے مجھے سبق مل گیا کہ موسم خراب ہو تو کھیتوں کی طرف نہیں جانا چاہیے یا جاتے ہوئے کم از کم ایک عدد گھڑی تو پاس رکھنی ہی چاہیے۔

ننھے نمازی

فیصل القدسی۔ پنوعاقل

حافظ عبداللہ صاحب عصر کی نماز کے لیے مسجد جا رہے تھے۔ وہ ابھی مسجد کے دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کی مسکراہٹ کا سبب سامنے سے آتا توقیر اور اُس کا چار سالہ بھتیجا داور تھے۔ دونوں کے سر پر ٹوپی تھی، جس کا مطلب تھا کہ وہ بھی نماز کے لیے آ رہے ہیں۔ قریب آنے پر توقیر رُکا اور بڑی گرم جوشی سے سلام کیا:

''السلام علیکم حافظ بھائی!''

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ! ماشاءاللہ! آج تو داود بھی نماز پڑھنے آیا ہے۔ کیسے ہو بھئی؟''

حافظ صاحب نے اپنا ہاتھ داور کی جانب بڑھایا تو داور نے گومگوں کی کیفیت میں ہاتھ تھام لیا۔

''توقیر! بھئی داور کو نماز کے لیے لے کر آتے رہا کرو۔ دیکھو، اب یہ مجھے کافی عرصے بعد دیکھ کر جواب بھی نہیں دے رہا۔'' حافظ صاحب نے توقیر کو مخاطب کیا۔

''جی حافظ بھائی! کوشش تو کرتا ہوں کہ اسے دن میں کم از کم دو نمازوں میں ضرور لے کر آؤں، مگر صاحب زادے اپنی مرضی کے مالک ہیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اسے لاتے رہا کرو۔ یوں اسے نماز کی اہمیت کا بھی پتا چلے گا اور مسجد اور نماز کی عادت بھی پڑ جائے گی۔ چلو، اب چلتے ہیں، جماعت کا وقت ہونے میں صرف تین منٹ باقی ہیں۔'' حافظ صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اندر کی طرف بڑھ گئے۔ توقیر بھی ان کے پیچھے ہی تھا۔

نماز کے لیے توقیر نے داور کو اپنے ساتھ کھڑا کیا، مگر وہ اپنی مرضی کی نماز پڑھتا رہا۔ کبھی سجدے میں چلا جاتا، کبھی سجدے کی جگہ پر چت لیٹ جاتا اور کبھی توقیر کے ارد گرد طواف کرنے لگتا۔ سلام پھیرتے ہی توقیر سے پچھلی صف میں بیٹھے ایک بابا جی نے اونچی آواز میں توقیر کو مخاطب کیا:

''بیٹا! بچوں کو مسجد میں نہیں لاتے۔ دیکھو، یہ خود بھی نماز پڑھ نہیں رہا تھا اور دوسروں کی نماز بھی خراب کر رہا تھا۔''

یہ سن کر توقیر کے ماتھے پر شکن اور چہرے پر ناگواری ابھری اور اُس نے گردن موڑ کر بابا جی کو گھورا، مگر خاموش ہی رہا۔ بابا جی سے شاید خود کو نظر اَنداز کیا جانا برداشت نہیں ہوا اور دُعا کے بعد وہ پھر توقیر سے الجھ پڑے:

''بیٹا! ایک تو میں تمھیں سمجھا رہا تھا اور تم سنی اَن سنی کر کے مجھے نظر اَنداز کر گئے۔'' بابا جی کافی ناراضی سے بول رہے تھے۔

''چاچا! آپ سمجھا نہیں رہے تھے، بل کہ اپنی مرضی کے فتوے جاری کر رہے تھے۔'' توقیر نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''بڑے بدتمیز ہو بھئی! میں کہہ رہا ہوں کہ بچوں کو مسجد نہیں لاتے اور تم بحث کر رہے ہو۔'' بابا جی غصہ ہو گئے۔

''چاچا! بچوں کو مسجد نہیں لائیں تو اور کہاں لے کر جائیں۔ عجیب بات کر رہے ہیں کہ مسجد مت لاؤ۔'' یہ کہہ کر توقیر نے داور کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی جانب چل دیا۔ بابا جی غصے میں اپنی مٹھیاں بھینچنے لگے۔ حافظ صاحب مصلے پر بیٹھے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ بابا جی کے مٹھیاں بھینچنے پر اُنھوں نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

.....☆.....

نماز والے واقعے کے کوئی دو دِن بعد حافظ صاحب صبح کے وقت چہل قدمی سے واپس آ رہے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ وہی بابا جی دو چھوٹے بچوں کا ہاتھ پکڑے چلے جا رہے ہیں۔ بچوں نے اسکول یونی فارم پہن رکھا تھا اور شاید وہ بابا جی کے پوتے تھے۔ دونوں بچے جڑواں دکھائی دے رہے

تھے اور قریباً چار سال کی عمر کے تھے۔ حافظ صاحب سمجھ گئے کہ بابا جی انھیں اسکول چھوڑنے جا رہے ہیں۔ وہ انھیں سلام کر کے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''السلام علیکم منظور صاحب! اسکول چھوڑنے جا رہے ہیں بچوں کو؟''

''وعلیکم السلام! جی حافظ صاحب!'' منظور صاحب کے لہجے میں فخر کا عنصر در آیا۔

''لیکن منظور! صاحب بچے تو ابھی چھوٹے ہیں اور آپ نے انھیں ابھی سے اسکول میں داخل کروا دیا ہے۔'' حافظ صاحب کی بات پر منظور صاحب مسکرائے۔

''حافظ صاحب! صحیح بات ہے نا! بچے چھوٹی عمر سے ہی جو سیکھیں گے وہ بڑے ہو کر بھی انھیں یاد رہے گا۔'' منظور صاحب نے ایسے انداز سے کہا جیسے کسی ناسمجھ بچے کو سمجھا رہے ہوں۔

''ٹھیک ٹھیک! آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے چھوٹی عمر سے ہی دنیاوی تعلیم حاصل کر لیں، تاکہ انھیں بڑے ہو کر یہ سب سیکھنا نہ پڑے، لیکن دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ بچوں کو مسجد میں نہ لایا جائے، کیوں کہ بڑے ہو کر وہ خود ہی دین سیکھ جائیں گے۔ کیا آپ کی ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں؟''

اب منظور صاحب چونکے اور اُن کی آنکھوں میں الجھن نے ڈورے ڈال لیے۔ انھیں نماز والا واقعہ یاد آیا۔

''نہیں حافظ صاحب! میرے کہنے کا مطلب تھا کہ..... دراصل بچے ہماری نماز خراب کرتے ہیں۔''

منظور صاحب اٹک اٹک کر بول رہے تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ ان کے اپنے ذہن میں گھڑی گئی بُودی دلیلوں پر چوٹ پڑی ہے۔

''یہ کیا بات ہوئی منظور صاحب!؟ چلیں، ہم تو گناہ گار ہیں، مگر آپ جیسے بزرگ اور تہجد گزار کی نماز بھی بچوں کی وجہ سے خراب ہونے لگی تو بس پھر..... آپ نے ان تابعی کا واقعہ تو سنا ہوگا جن کا ایک پاؤں کسی بیماری کی وجہ سے کاٹنا پڑ گیا تھا تو اُن تابعی نے اپنا پاؤں نماز کی حالت میں کٹوایا تھا اور اُنھیں خبر تک نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان کی نماز تھی کہ پاؤں کٹ گیا، مگر نماز میں خلل نہ آیا اور یہاں بچوں کی وجہ سے ہماری نمازیں خراب ہو جاتی ہیں!'' حافظ صاحب نے بات ختم کی اور منظور صاحب کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

''وہ تو ٹھیک ہے حافظ صاحب! مگر بچے نماز کے دوران میں ارد گرد گھومتے رہتے ہیں تو.....'' منظور صاحب نے کمزوری آواز میں ایک آخری کوشش کی۔

''وہی تو منظور صاحب! ہماری توجہ نماز میں کم از کم اتنی تو ہونی چاہیے کہ ہماری نماز کو اپنے آس پاس گھومتے بچوں سے کوئی خطرہ نہ ہو۔''

منظور صاحب کی پیشانی عرق ندامت میں اور آنکھیں سوچ میں غرق تھیں۔

یہ دیکھ کر حافظ صاحب نے ایک آخری چوٹ لگائی:

''منظور صاحب! اس بارے میں سوچیے گا ضرور کہ آپ کس وجہ سے آج کے بچوں اور کل کے بڑوں کو مسجد سے دور کر رہے ہیں، جب کہ انھی بچوں کو آپ بخوشی اسکول چھوڑنے جا رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ دنیاوی تعلیم سے دنیاوی فائدہ حاصل ہوگا، جو نظر بھی آ رہا ہے، جب کہ دین سے جڑنے میں اخروی فائدہ نصیب ہوگا، جو کسی کو نظر نہیں آتا، اور ہم اس چیز پر یقین کرنے سے جھجکتے ہیں جو نظر نہ آئے۔ شاید یہ ہمارے ایمان کی کمزوری ہے۔'' یہ کہہ کر حافظ صاحب نے اجازت لی اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

.....☆.....

حافظ عبداللہ صاحب نے جمعے کا بیان اپنے وقت سے چند منٹ پہلے ختم کیا اور خصوصی توجہ کا کہہ کر فرمانے لگے:

''بھائیو! آج جمعۃ المبارک ہے۔ جمعے کے دن کو ہمارے دین میں دنوں کا سردار کہا جاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ یہ عید کا دن ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جمعے کی نماز میں ہم اپنے چھوٹے بچوں کو ضرور ساتھ لائیں۔ اس سے انھیں جمعۃ المبارک کی اہمیت و فضیلت کا احساس ہوگا۔

ایک اور بات کہ کئی دوست بچوں کو مسجد میں لانے کے شرعی احکام جاننا چاہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ اس بچے کو مسجد لا سکتے ہیں جو مسجد کے آداب کی رعایت کر سکتا ہو۔ ایسی سمجھ داری عموماً پانچ چھے سال کی عمر کے بچوں میں پائی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ بچوں کو ہمیشہ اپنے ساتھ کھڑا کریں، کیوں کہ جو کچھ آپ کریں گے بچہ بھی اسی کی نقل کرے گا اور یوں ناسمجھی کے عالم میں بھی وہ نماز سیکھ جائے گا۔

اکثر ہوتا یہ ہے کہ ہم بچوں کو آخری صف میں دھکیل دیتے ہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔ جب کئی سارے بچے جمع ہوں گے تو وہ مل کر اُودھم ہی مچائیں گے اور پھر ہم ان کی شکایت کرتے ہیں کہ جی بچے شرارت کرتے ہیں۔ بچوں کو اپنے ساتھ ضرور لائیں اور اپنے ساتھ کھڑا کریں۔ دورانِ سجدہ میں حضورِ اقدس ﷺ کی پیٹھ پر حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے کھیلنے والا واقعہ تو آپ سب نے سنا ہی ہوگا۔ اسی سے اندازہ لگا لیں کہ بچوں کو مسجد میں لانا سنت رسول بھی ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 47 پر

دو راجو ...... فاتح کون ۲

نذیر انبالوی۔ لاہور

نگران کی بات سن کر راجو کھڑا ہو گیا۔نگران نے راجو کی تلاشی لینا شروع کی تو وہ بولا:

’’میرے پاس کچھ نہیں ہے، مجھے پرچہ کرنے دیں۔‘‘

نگران نے اس کی بات پر کان نہ دھرے۔ وہ خاموشی سے اس کی تلاشی لیتا رہا۔نگران نے اس کی جیب سے کچھ کاغذات نکال کر میز پر رکھ دیے۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘ نگران نے راجو کو گھورا۔

’’یہ......ہاں......وہ......‘‘ راجو سے کوئی جواب بن نہ پار ہا تھا۔نگران اسے ایک طرف لے گیا۔ کچھ دیر بعد اُس کا پرچہ کالعدم کر دیا گیا۔ راجو رویا، گڑگڑایا، مگر اُسے پرچہ کرنے نہیں دیا گیا۔

اس پر کیس نہیں بنایا گیا تھا، ورنہ وہ کئی سال تک کے لیے امتحان نہ دے پاتا۔اس کا صرف پرچہ کالعدم کیا گیا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

راستے کی ہر چیز اُسے بہت بُری لگ رہی تھی۔

اس سے امید لگائے والدین گھر میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ انھیں جب معلوم ہوگا کہ وہ نقل کرتے پکڑا گیا ہے تو اُن پر تو قیامت گزر جائے گی۔ ابھی دس پندرہ دن پہلے کی تو بات ہے۔ ابا جان فیکٹری سے رات گئے لوٹے تھے۔ وہ بہت تھک گئے تھے۔ انھوں نے راجو کو پڑھتے ہوئے دیکھا تو کہا تھا:

’’تم تعلیم مکمل کرلو، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ دل لگا کر پڑھو اور آگے بڑھو۔‘‘

یہ جملہ بار بار راجو کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ بے ایمانی کے راستے پر چل کر کامیابی حاصل کرلے گا، مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو کر ایک باغ میں بیٹھ گیا۔ اس کا گھر جانے کو دِل نہیں چاہ رہا تھا۔

اُسے معلوم تھا کہ گھر جا کر پرچے کے بارے میں امی ابو پوچھیں گے۔

وہ جیسے ہی وہ باغ میں بیٹھا اس کی نظر وہاں بچوں کے کھلونے بیچنے والے ایک شخص پر پڑی۔ وہ شخص راجو کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا نام رحمت اللہ تھا۔ وہ شخص سمجھ گیا تھا کہ راجو پریشان ہے۔ وہ کچھ دیر تو خاموش رہا، پھر اُس کے پاس بیٹھ کر نہایت محبت بھرے لہجے میں پوچھا:

’’بتاؤ، کیا پریشانی ہے؟‘‘

’’پریشانی! کیا کریں گے میری پریشانی جان کر؟‘‘ راجو نے رحمت اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میں رحمت اللہ ہوں، یہاں بچوں کے کھلونے بیچنے کا کام کرتا ہوں۔ مجھے اپنی پریشانی بتادو، میں کچھ نہ کر سکا تو تمھارا دِل تو ہلکا ہو ہی جائے گا۔ بتاؤ، کیا بات ہے؟‘‘ رحمت اللہ نے یہ بات اتنے پیار سے کہی کہ راجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ زاروقطار رونے لگا۔

’’وہ پرچہ......میں اب کیا کروں گا۔‘‘ راجو اتنا ہی کہہ سکا۔

’’کیسا پرچہ؟‘‘ رحمت اللہ کچھ سمجھ نہ پایا تھا۔

پھر راجو نے ساری بات رحمت اللہ کو بتادی۔

''ارے، اتنی سی بات سے پریشان ہوگئے ہو! دوبارہ تیاری کرو، خوب پڑھو، پہلے جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ۔ ایسا کروگے تو کامیابی تمھارے قدم چومے گی۔ تم آسانی سے کامیاب ہوجاؤ گے۔'' رحمت اللہ تو بولتا ہی چلا گیا۔

''کیا ایسا ہوسکتا ہے؟'' راجو کو مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرن نظر آئی۔

''ایسا تبھی ہوگا جب تم محنت کروگے اور بے ایمانی کے راستے پر چلنے سے توبہ کروگے۔ محنت کرنے والا انسان کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ کوشش کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' رحمت اللہ نے کہا۔

''وہ امی ابو کو کیا بتاؤں؟'' راجو نے سوال کیا۔

''سچ میں بہت طاقت ہوتی ہے! جھوٹ مت بولو، ہر بات گھر جا کر سچ سچ بتادو۔ تمھارے والدین کو اس بات سے دکھ تو ہوگا، مگر جب تم محنت کروگے اور کامیابی حاصل کروگے تو اُن کا دکھ ختم ہوجائے گا اور والدین کی دعاؤں سے تم کامیاب ہوجاؤ گے۔'' رحمت اللہ کے دکھائے راستے پر چلتے ہوئے راجو گھر پہنچا۔ ابا جان فیکٹری سے آچکے تھے۔

''بیٹا! پرچہ کیسا ہوا؟'' ابا جان نے راجو کو دیکھ کر سوال کیا۔

''مجھے پرچہ دوبارہ دینا پڑے گا۔ میں بے ایمانی کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ میں اب محنت کروں گا، خوب پڑھوں گا۔ میں شرمندہ ہوں، میں بہک گیا تھا۔'' راجو نے روتے ہوئے جواب دیا۔

ابا جان یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے، پھر وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے:

''اللہ تعالیٰ تمھارا حامی و ناصر ہو، میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ تمھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ جب غلطی کا احساس ہوجائے تو ہر رکاوٹ دور ہوجاتی ہے۔''

قریب بیٹھی ماں نے بھی ساری بات سن لی تھی۔

''امی جان! میں شرمندہ ہوں، اب غلطی نہیں کروں گا۔ اب ان شاء اللہ! آپ کی امیدوں پر پورا اُتروں گا۔''

''ان شاء اللہ!'' امی جان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس وقت راجو کو یوں محسوس ہونے لگا کہ کامیابی اس کے اردگرد ہی موجود ہے۔

وہ رات کے وقت کتابیں لے کر بیٹھا تو بے ایمانی اس کے پاس موجود تھی۔

''گھبرا گئے، پریشان ہوگئے، میرے ہوتے تمھیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اب پڑھنا بند کرو، سوجاؤ یا موبائل فون استعمال کرو، میں تمھارے ساتھ ہوں۔'' بے ایمانی کی بات راجو کو ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی۔ وہ غصے سے بولا:

''ابھی اور اِسی وقت میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ میں پہلے بھی تمھاری باتوں میں آگیا تھا، اب میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ ایمان داری کا راستہ ہی کامیابی کا راستہ ہے۔ اب یہاں سے چلی جاؤ۔''

''ایمان داری.....!'' بے ایمانی نے نہایت نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''میرا وقت ضائع مت کرو، جاؤ یہاں سے۔'' راجو نے چلّا کر کہا تو بے ایمانی وہاں سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں ایمان داری کی خوش بُو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ راجو کو پڑھتے دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔

راجو اَب باغ میں بھی جاتا تھا۔ رحمت اللہ اسے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ ایک دن رحمت اللہ نے اسے کہا کہ وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے باغ میں بچوں کے کھلونے بیچ لیا کرے۔ اس طرح کچھ آمدنی ہوجائے گی۔ راجو نے اسے بتایا کہ اس کے پاس تو ایک روپیا بھی نہیں ہے، پھر وہ کس طرح بچوں کے کھلونے بیچ سکتا ہے۔ رحمت اللہ نے یہ سن کر کہا:

''میں سیٹھ سے بات کرلوں گا، وہ کھلونے ادھار دے دیں گے، میں بھی تو اُن سے ادھار کھلونے لے کر آتا ہوں۔ میں تمھاری ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں۔ چند گھنٹے کھلونے بیچو اور پھر پڑھائی کرو۔''

رحمت اللہ کی باتوں میں وزن تھا، مگر والدین سے اجازت بھی ضروری تھی۔

''اگر تمھاری پڑھائی متاثر نہ ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اجازت لینے پر ابا جان کا جواب تھا۔

''نہیں ابا جان! میری پڑھائی متاثر نہ ہوگی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ پڑھائی پر پوری توجہ دوں گا۔'' راجو اَب پہلے والا راجو نہیں رہا تھا۔

ایک دن راجو باغ میں کھلونے بیچ کر پڑھ رہا تھا کہ وہ نگران وہاں آگیا جس نے اسے امتحانی مرکز میں پکڑا تھا۔ راجو نے اسے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا۔

''میں اسٹار اِسکول میں استاد ہوں۔ اگر کوئی مشکل ہو تو میں تمھاری مدد کرسکتا ہوں۔'' نگران توصیف نے کہا۔

''بہت شکریہ! اگر ضرورت ہوئی تو آپ سے رابطہ کروں گا، آپ اپنا موبائل نمبر مجھے دے دیں۔'' راجو بولا۔

رابطہ نمبر ملنے پر راجو گاہے بگاہے توصیف صاحب سے راہ نمائی لیتا رہتا۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب امتحان شروع ہو رہے تھے۔ ایمان داری کی خوش بُو راجو کے ساتھ تھی۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ امتحانی مرکز میں داخل ہوا۔ اس نے جب انگریزی کا پرچہ دیکھا تو اُسے تمام سوالات کے جوابات

آتے تھے۔ وہ پرچہ کرنے میں مصروف تھا کہ نگران اس کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ راجو کی پوری توجہ پرچے پر تھی۔

''کھڑے ہوجاؤ۔'' راجو یہ جملہ سن کر فوراً کھڑا ہوگیا۔

تلاشی کا عمل شروع ہوا۔ راجو کی جیب سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ اپنا پرچہ حل کرنے میں مصروف تھا، پھر امتحانی مرکز میں شور مچا کہ چھاپا ٹیم آرہی ہے، کسی کے پاس اگر نقل کے لیے کچھ مواد ہے تو فوراً باہر نکال دے، ورنہ پکڑے جانے کی صورت میں پرچہ کالعدم ہوجائے گا۔ کسی امیدوار نے اپنی جیب سے کچھ نہ نکالا۔ چھاپا مار ٹیم آ پہنچی۔ امتحانی مرکز میں مکمل خاموشی تھی۔

چھاپا مار ٹیم میں چار لوگ شامل تھے۔ وہ ایک ایک امیدوار کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جس پر شک ہوتا اس کی تلاشی بھی لی جاتی۔ دائیں طرف ایک امیدوار کی تلاشی لی تو اُس کی جیب سے نقل کا خاصا مواد برآمد ہوا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟'' ایک آدمی نے پوچھا۔

''میرا نام راجو ہے۔'' امیدوار نے جواب دیا۔

''یہ تو میرا ہم نام ہے۔'' راجو بڑبڑایا۔

دوسرے راجو کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کا پرچہ کالعدم کر دیا گیا تھا۔ اسے مرکز سے باہر جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ ایک راجو سر جھکائے بیٹھا تھا، جب کہ دوسرا تیزی سے اپنا پرچہ حل کر رہا تھا۔ جب پرچے کا وقت ختم ہوا تو دونوں راجو مرکز سے باہر آ چکے تھے۔ ایک راجو خوش اور دوسرا پریشان تھا۔ خوش راجو نے پریشان راجو کے قریب جا کر کہا:

''میرا نام بھی راجو ہے۔ میں بھی پچھلی بار پکڑا گیا تھا، میری حالت بھی تمھارے جیسی تھی۔ میں نے بھی بے ایمانی سے دوستی کر لی تھی اور تم نے بھی۔ اب میرا ہاتھ پکڑ لو، میرے ساتھ چلو۔'' پریشان حال راجو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

کچھ دیر بعد دونوں راجو باغ میں رحمت اللہ کے سامنے بیٹھے تھے۔ رحمت اللہ کی باتوں سے پریشان راجو کی پریشانی جاتی رہی۔ اس کے اردگرد بھی ایمان داری کی خوش بُو پھیلتی چلی گئی۔

نتیجہ آیا تو ایمان داری کے راستے پر چلنے والا راجو کام یاب ہوا تھا۔ راجو نے اب دوسرے راجو کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اگلے امتحان میں دوسرا راجو بھی شان دار کام یابی حاصل کر چکا تھا۔ بے ایمانی کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔

.....☆.....

بے ایمانی، غصہ اور شرشر ایک جگہ موجود تھے۔ ان کے چہار سو مایوسی کے اندھیرے تھے۔ وہ سوچوں میں گم تھے کہ دھوکے نے ان پر دھوکے کا جال پھینکا تو سب اس میں پھنس گئے۔ تینوں کی نظریں دھوکے پر تھیں۔ دھوکا انھیں جال میں قید کیے ملکہ بدی کے دربار میں لے آیا۔ شرشر نے جال سے نکلتے ہی اپنے مخصوص انداز میں کہا:

''میں شیطان ابن شیطان شرشر ہوں، میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ نیکی نگر کے ایک ایک باسی کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔ میں آگ ہوں آگ۔''

ملکہ بدی نے اسے گھورا۔ وہ چند لمحے تو خاموش رہا، پھر چلّانے لگا:

''میں شیطان ابن شیطان ہوں، ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔''

''خاموش رہو، میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ ان تینوں کو قید خانے میں ڈال دیا جائے۔'' ملکہ بدی کے حکم پر دھوکا آگے بڑھا۔ شیطان ابن شیطان نے منہ میں کچھ پڑھ کر اپنے اردگرد پھونکا تو اُس کے اردگرد آگ لگ گئی۔ اس آگ میں شرشر شیطان ابن شیطان غائب ہوگیا۔ دھوکے نے بے ایمانی اور غصے کو پکڑ کر قید خانے میں قدم رکھا تو اُنھوں نے بدی پورہ کے ایک اور باسی کو وہاں دیکھا اسے دیکھتے ہی انھوں بیک زبان کہا:

''تم بھی یہاں ہو!؟''

(بدی پورہ کا یہ باسی کون تھا؟ یہ جاننے کے لیے پڑھیے اگلی قسط)

پیڑ اور خوراک

انصار احمد معروفی قاسمی۔ یوپی، انڈیا

اے مری امی! یہ سارے پیڑ کاہل لگتے ہیں
جب بھی دیکھو ، اک جگہ پر ہی کھڑے یہ رہتے ہیں
تھک نہیں جاتے ہیں کیا یہ اک جگہ رہ کر کھڑے؟
مجھ کو لگتا ہے کہ یہ سب پیڑ ہیں عہدی بڑے
ساتھ لے جانے کو آتی ہیں ہوائیں زور کی
وہ ہوا جس میں صدائیں گونجتی ہیں شور کی
ان کو وہ آکر ہلاتی ہیں ہوائیں زور سے
پَر نہیں لے جاسکیں ان کو کسی بھی طور سے
مست ہوجاتے ہیں لیکن یہ ہوا پاتے ہیں جب
جھوم کر پھر ''ویلکم'' کہتے ہوا کو ہیں یہ سب
چھوڑ کر ان کو ہوا لہرا کے آگے بڑھ گئی
شور وہ کرتی ہوئی پھر پربتوں پر چڑھ گئی
اے مری امی! کہیں یہ پیڑ کیوں جاتے نہیں؟
اک جگہ رہ کر کھڑے کیا پیڑ اُکتاتے نہیں؟
پھول آتا ہے تو خوش بُو بھی نہیں یہ سونگھتے
اک بجا ہو رات کا پھر بھی نہیں یہ اونگھتے
کچھ نہیں کھاتے ہیں امی! پھر بھی رہتے ہیں ہرے
کیا جیا کرتے ہیں دنیا میں کسی کے آسرے؟
میری بچی! دھوپ اور مٹی سے یہ خوراک لیں
اک جگہ جب تک رہیں یہ ، تب تلک زندہ رہیں

وہ دونوں آپس میں بُری طرح گتھم گتھا تھے۔ قریب ہی ایک دودھ کی پھٹی ہوئی تھیلی پڑی تھی، جس میں سے سارا دودھ بہہ چکا تھا۔

''تیمور! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے آرہے تھے کہ گلی میں اپنے پوتے کو محلے کے بچے کے ساتھ ہاتھا پائی کرتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فوراً آگے بڑھ کر اُن دونوں کو ایک دوسرے کی گرفت سے چھڑوایا۔

دوسرا لڑکا بُری طرح رو رہا تھا۔ زمین پر گرنے کی وجہ سے اس کے کپڑے بھی مٹی میں اَٹ چکے تھے، جب کہ ان کے پوتے تیمور کے ہونٹ سے خون رِس رہا تھا۔

''کیوں لڑ رہے تھے تم دونوں؟''

وہ سخت لہجے میں دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے۔

''دادا اَبو! میں دودھ لے کر گھر جا رہا تھا کہ اس نے پیچھے سے آکر اَچانک مجھے پکڑ لیا اور میرے ہاتھ سے دودھ کی تھیلی گِر کر پھٹ گئی۔'' تیمور اِتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''انکل! میں نے تو مذاق میں اسے پکڑا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ہاتھ میں دودھ ہے، ورنہ میں کبھی ایسا مذاق نہ کرتا۔'' دوسرا لڑکا طاہر لال چہرہ لیے اپنی غلطی کی وضاحت کرنے لگا۔

''اوہ! تو یہ معاملہ ہے۔ طاہر بیٹے! آپ اپنے گھر جاؤ، منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو۔ جاؤ شاباش۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے بولے اور تیمور کا ہاتھ تھامے گھر کی جانب چل دیے۔

.....☆.....

''اتنی دیر سے کہاں تھے تم!؟ میں نے کب سے دودھ لینے بھیجا ہوا ہے اور یہ ہونٹ کیسے پھٹ گیا؟'' رعنا، تیمور کو دیکھ کر فکر مندی سے پوچھنے لگی۔

''کچھ نہیں ہوا بیٹا! بچے ہیں، آپس میں چھوٹی موٹی لڑائیاں ہو ہی جاتی ہیں۔'' وہ صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولے، جب کہ تیمور سر جھکائے کھڑا تھا۔

''ابا جی! یہ لڑکا حد سے زیادہ بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر چھوٹے بھائی بہن کو بھی مارنے کو دوڑتا ہے۔ سب سے بڑا ہے، پر عقل نام کو نہیں۔''

رعنا پہلے ہی اس کی غصیلی طبیعت سے خائف تھی اور آج تو نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ وہ باہر بھی کسی سے لڑ کر آیا تھا۔ وہ بیٹے کی طرف سے بہت فکر مند رہنے لگی تھی۔

.....☆.....

فرقان صاحب آج کل چھوٹے بیٹے فیضان کے پاس اپنے کسی کام کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے۔ انھیں آئے ہفتہ ہو چلا تھا، ابھی انھیں اپنے کام کی وجہ سے مزید کچھ دن لگ سکتے تھے۔ وہ جب سے یہاں آئے تھے یہی دیکھ رہے تھے کہ ان کا بیٹا گھر اور بچوں کو صحیح طرح وقت اور توجہ نہیں

اللہ تعالیٰ کے پیارے

بنت مسعود احمد۔ کراچی

دے پارہا، خصوصاً تیمور عمر کے جس دور سے گزر رہا ہے اس عمر کے بچے اکثر جذباتی ہو ہی جاتے ہیں اور خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ فیضان صبح کا گیارات کو تھکا ہارا لوٹتا، پھر کھانا کھا کر کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھ کر حال احوال پوچھ کر سونے چلا جاتا۔

اتوار کا دِن سودا سلف لانے یا پھر کہیں آنے جانے میں نکل جاتا تھا۔

.....☆.....

آج کے واقعے نے فرقان صاحب کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا، پھر بہو کی کہی باتیں بھی انھیں فکرمند کر گئی تھیں۔ انھیں اپنا گزرا وقت یاد آنے لگے۔ شام کو آفس سے آکر وہ کچھ دیر آرام کرتے، پھر عشا کی اذان ہوتے ہی وہ فیضان اور نعمان کا ہاتھ تھامے انھیں مسجد لے جاتے۔ مسجد سے واپسی پر کبھی چنے، کبھی ریوڑیاں اور کبھی کوئی پھل انھیں دلاتے، پھر رات کا کھانا کھا کر وہ بچوں کو لے کر بیٹھ جاتے، کبھی قصص الانبیاء، کبھی سبق آموز کہانیاں اور کبھی سیرت کی کتاب سے روشن احوال سنائے جاتے۔ ان کے دونوں بیٹے اور تینوں بچیاں بہت ذوق وشوق یہ سب کچھ سنتے۔ آخر میں وہ سنائے ہوئے قصے یا کہانی سے متعلق چھوٹے چھوٹے آسان سوال کرتے۔ جو سب سے زیادہ صحیح جواب دیتا وہ اسے انعام دیتے۔ یوں بچے خوب لگن اور دِل جمعی سے واقعات سنتے اور یہ قصے اور کہانیاں ان کے ننھے ذہنوں میں ثبت ہو جاتے۔

وہ حسین ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ پوتی کے رونے کی آواز نے ان کی توجہ کے تانے بانے بکھیر دیے۔

''مریم!'' وہ کمرے سے باہر آئے اور روتی ہوئی مریم کو آواز دِی۔

''دادا ابو! بھیا نے میری گڑیا توڑ دِی۔'' وہ ان کے پاس آکر روتے ہوئے بولی۔

''تیمور!'' مریم کو گود میں لے کر چپ کراتے انھوں نے اسے پکارا۔

اتنے میں تیمور میاں بھی روتے روتے ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''اب تم کیوں رو رہے ہو؟''

''امی نے مارا ہے۔'' اس نے اپنا ہاتھ گال سے ہٹایا جو سُرخ ہو رہا تھا۔

''کیوں مارا ہے؟ کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''مریم نے میری کتاب کا صفحہ پھاڑ دیا تھا تو.....'' وہ اتنا بول کر خاموش ہوا۔

''تو تم نے اس کی گڑیا توڑ دِی؟'' انھوں نے اس کا ادھورا جملہ مکمل کیا۔

''ہمم.....'' وہ سر جھکائے اتنا ہی بولا۔

''تیمور بیٹا! یہ دیکھو کہ مریم آپ سے کتنی چھوٹی ہے، وہ ناسمجھ ہے، لیکن آپ تو ماشاء اللہ! بڑے ہو، سمجھ دار ہو۔ کیا یہ اچھی بات ہے کہ بڑے ہو کر چھوٹوں کی برابری کرو اور اُن سے مقابلہ کرو۔ کل تم نے عمار کو صرف اتنی سی بات پر دھکا دیا کہ وہ تمھاری جگہ پر آ بیٹھا تھا۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لیے کمرے میں آ بیٹھے، مریم کو وہ رعنا کی گود میں دے آئے تھے۔

اب دادا پوتا آمنے سامنے مسہری پر بیٹھے تھے۔

''بیٹے اپنی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچانا کیا اچھی بات ہے؟ مریم اور عمار، دونوں تم سے چھوٹے ہیں، وہ وہی کریں گے جو تم کرو گے۔ اسی طرح طاہر تمھارا اتنا اچھا دوست ہے، تم اس کے ساتھ اسکول جاتے ہو، ٹیوشن جاتے ہو، کرکٹ کھیلنے جاتے ہو۔ اگر اُس نے مذاق میں تمھیں پکڑ لیا اور دودھ کی تھیلی گر گئی تو جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو گیا، مگر تم غصے سے بے قابو ہو کر اُسے مارنے لگے۔

یہ کیا اچھی بات ہوئی؟ اس نے دودھ جان بوجھ کر تو نہیں گرایا تھا نا! مگر تم نے اسے جان بوجھ پر زمین پر گرا دیا تھا۔''

''اس نے بھی میرے ہونٹ پر زور سے مارا تھا۔'' وہ اپنا سوجا ہونٹ انھیں دکھانے لگا۔

''مگر بیٹے! مارنے میں پہل تو تم نے ہی کی تھی نا!؟''

''جی، یہ میری غلطی تھی۔''

''اچھا یہ بتاؤ، کاپی پر کچھ لکھتے ہو اور کسی لفظ کو لکھتے وقت غلطی ہو جاتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟''

''ربڑ سے مٹا کر دوبارہ لکھ لیتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔

''بس اب یہی کام ان غلطیوں کو سدھارنے کے لیے بھی کرنا پڑے گا جو تم کر چکے ہو۔''

''وہ کیسے دادا ابو!؟''

''سب سے پہلے یہ عزم کرو کہ کبھی بھی کسی کو اپنی ذات سے تکلیف نہیں پہنچاؤ گے۔ اگر یہ ایک کام کر لو گے تو پھر کبھی کوئی جھگڑا ہی نہیں ہو گا۔''

''میں کوشش کروں گا دادا ابو! پر جب کوئی مجھے تنگ کرتا ہے تو مجھے غصہ آ جاتا ہے۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے، مگر بدلہ لینے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو بندے کا معاف کر دینا پسند ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسے بندے پسند ہیں جو لوگوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں۔''

ہمارے پیارے نبی ﷺ بھی بہت معاف کرنے والے اور درگزر

کرنے والے تھے اور اللہ تعالیٰ ہر اُس شخص کو محبوب رکھتا ہے جو اُس کے محبوب ﷺ کے طریقے کو اپناتا ہے۔ بے شک ہمارے نبی ﷺ انسانیت کے سب سے اعلیٰ اور اَرفع درجے پر فائز ہیں، اسی لیے ان کی زندگی ہمارے لیے نمونہ ہے اور اُن کے نقشِ قدم پر چل کر اگر ہم اپنی دنیاوی زندگی گزاریں گے تو ہم کام یاب ہوجائیں گے۔ جانتے ہو نبی ﷺ کے عمل کی نقل کی برکت سے ہمیں کیا ملے گا؟'' دادا جان نے رُک کر اُس سے سوال کیا۔

''اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہوجائیں گے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

وہ اس کا جواب سن کر مسکرائے اور بولے: ''بالکل ٹھیک! اور اللہ تعالیٰ خوش ہوکر جنت عطا فرمادیں گے۔''

''پَردادا ابو! میں کیسے ان کے طریقے پر عمل کرسکتا ہوں؟''

''بیٹے! ہر مسلمان کو نبی ﷺ کی سیرت اپنانی چاہیے۔ اس کے لیے پہلے سیرت کو پڑھو، سمجھو اور اُسے سیکھو، تھوڑی کوشش اور محنت سے یہ اچھی عادتیں خود بخود تمھاری عادات میں شامل ہونے لگیں گی۔

کچھ سمجھ آئی میری بات؟'' بات ختم کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

''جی دادا ابو! میں سمجھ گیا، ہمیں اپنے نبی ﷺ کی اچھی عادتیں سیکھنی اور اپنانی چاہییں، تاکہ ہم بھی اللہ تعالیٰ کے پیارے بن جائیں۔''

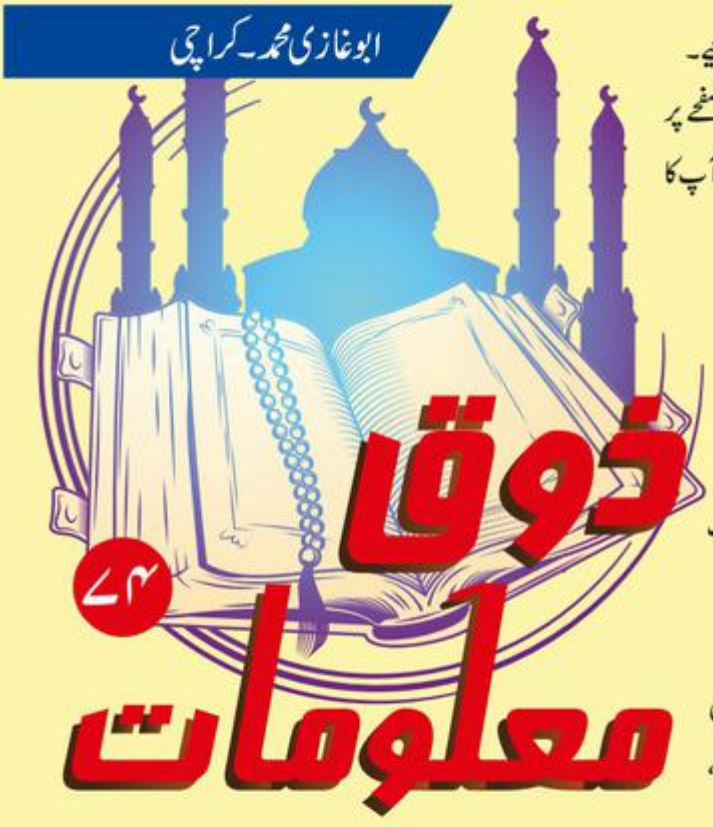

ابو غازی محمد۔ کراچی

یہ کُل پانچ اشارات ہیں۔ آپ ان کی مدد سے درست جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ ان اشارات کے ذریعے جواب تک پہنچ جائیں تو بُوجھا گیا جواب آخری صفحے پر موجود کوپن کے ساتھ ہمیں ارسال کردیجیے اور اپنی معلومات کا انعام ہم سے پائیے۔ آپ کا جواب ۳۱، مارچ تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔

یہ کیا ہے؟

1. یہ ایک پھل ہے جو ذائقے میں میٹھا اور گرم تاثیر کا حامل ہے اور دنیا کے کئی ممالک میں پایا جاتا ہے، خصوصاً سعودی عرب اور عراق میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔
2. قرآن مجید میں کئی جگہ اس پھل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
3. اس پھل میں وٹامنز (حیاتین) اے، بی اور سی، پروٹین (لحمیات)، فیٹس (چکنائی)، کاربوہائیڈریٹ (نشاستہ)، کیلشم، پوٹاشیم، میگنیشیم، گندھک، جست، تانبا، آئیوڈین، فاسفورس، فولاد اور آرسینک جیسے اہم عناصر موجود ہوتے ہیں۔
4. اس پھل کا استعمال خون کی کمی کو دُور کرتا ہے۔ خون میں کولیسٹرول کی مقدار کو بڑھنے سے روکتا ہے۔ معدے، اعصاب، دل اور دِماغ کو طاقت دیتا ہے۔ خشک کھانسی، دمے کی تکلیف، پھیپھڑوں کی کمزوری اور جسمانی کمزوری کو بھی دُور کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے ''نسیان'' (بھولنے کی بیماری) سے نجات مِل جاتی ہے۔ ہاتھوں اور پیروں میں رعشہ (کپکپاہٹ) ہو تو یہ بیماری بھی اس پھل کے متواتر اِستعمال سے دور ہوجاتی ہے، (بشرطے کہ یہ مرض بڑھاپے کی وجہ سے نہ ہو)۔ یہ پھل معدے کی بڑھی ہوئی تیزابیت کو کم کرکے اعتدال پر رکھتا ہے۔

اس پھل میں موجود گندھک پیٹ میں موجود جراثیم کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ (اگر معدے میں زخم موجود ہوں تو اُن) زخموں کو بھی بھرنے میں مدد دیتی ہے۔

اس پھل کے ایک چھٹانک وزن میں 160 حرارے (توانائی کی مقدار) موجود ہوتے ہیں۔

5. اردو زبان میں اس پھل کا نام چار اَور انگریزی زبان میں پانچ حروف پر مشتمل ہے۔

مکھی اور مکڑی

صائمہ مسلم۔کراچی

شہد کی ایک مکھی، جس کا نام روہی تھا، ہواؤں کی سیر کرتی ہوئی جارہی تھی۔ روہی مکھی ہواؤں میں جھومتی ہوئی باغ میں جا پہنچی۔

باغ میں ہر طرف طرح طرح کے پھول پتے ہواؤں میں جھومتے نظر آرہے تھے۔ لال، گلابی، پیلا، کالا، سفید، غرض باغ میں ہر رنگ کے پھول جگہ جگہ لگے باغ کو چار چاند لگا رہے تھے۔

شہد کی مکھی اڑتی ہوئی اپنے مخصوص لال گلاب کے پھول کے پاس پہنچ کر اُس پر جا بیٹھی۔ اسے لال گلاب بے حد پسند تھے۔

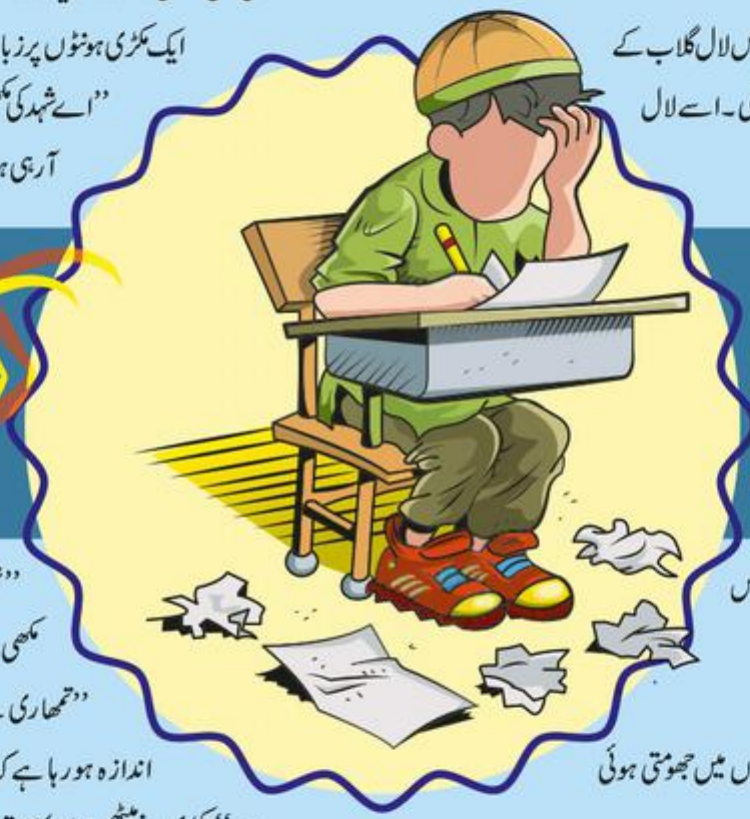

شہد کی مکھی گلاب کے کا رَس چوسنے لگی، تاکہ شہد تیار کر سکے۔

.....☆.....

ہر روز ہی بہت سی مکھیاں ہواؤں میں جھومتی ہوئی باغ میں جایا کرتی تھیں۔

آج سب مکھیوں کو اپنے گھر (چھتے) کی صفائی کرنا تھی۔ ایک مکھی جو سب سے زیادہ نکمی تھی، وہ ہر وقت بس گھومنے پھرنے کے کاموں میں آگے آگے رہتی تھی۔ وہ اپنا ہر انداز سب کو فخریہ بتایا کرتی تھی اور ضرورت سے زیادہ خود کو ہوش یار گردانتی تھی۔ وہ ہمیشہ خود کو دوسروں سے الگ سمجھتی اور ہر کام اکیلے کرنے کی کوشش میں لگی رہتی۔ جب اسے موقع ملتا اکیلے ہی چھتے سے باہر نکل جاتی اور شام ہونے تک گھوم پھر کر واپس آجاتی۔

آج بھی جب سب کاموں میں مصروف تھے، روہی مکھی شہد لینے اکیلے ہی باغ کی طرف نکل پڑی۔ وہ جھومتی ہوئی سیر کرتی باغ میں جا پہنچی اور اپنے پسندیدہ پھول، گلاب کے پھول کا رَس چوسنے میں محو ہوگئی۔

روہی مکھی کو بھنک بھی نہ پڑی جب اسے کسی نے زور سے جھپٹا۔ قسمت اچھی تھی۔ روہی مکھی آخری لمحے میں گلاب کے پھول سے پتوں کی طرف سرک کر خود کو بچانے میں کام یاب ہوئی۔

رَس چوسنے کا کام وہ مکمل کر چکی تھی، اس لیے فوراً ہی وہاں سے بچ کر نکل گئی۔ واپسی پر راستے میں اسے اپنے آپ پر بہت غرور آیا۔ وہ خود کو کسی کیڑے کا کھانا بننے سے بچا لینے پر اور زیادہ مغروریت محسوس کرنے لگی۔

خوشی میں جھومتی وہ تھک کر ایک درخت پر بیٹھ گئی۔ درخت کے دوسری طرف ایک مکڑی ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔

''اے شہد کی مکھی! ذرا یہ تو بتاؤ، کہاں سے اڑان بھر کر آرہی ہو۔'' مکڑی نے روہی مکھی کو مخاطب کیا۔

''تم کیوں پوچھ رہی ہو مکڑی بی!؟'' روہی مکھی نے مغرور انداز میں کہا۔

''تمھاری بے ترتیب سانسوں کی آواز سے بخوبی اندازہ ہو رہا ہے کہ تم نے آج بہت محنت اور مشقت کی ہے۔'' مکڑی نے میٹھی زبان کا استعمال کیا۔

''ہاں، آج میں اکیلے ہی ڈھیر سارا شہد جمع کر لائی ہوں۔ آج میں سب کو بتاؤں گی کہ کیسے میں نے خود کو ایک کیڑے سے بھی بچایا ہے۔''

روہی مکھی اپنے دھن میں مگن مکڑی کو سب بتا گئی۔ ایک بار پھر مکڑی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ارے مکھی! تم تو بہت بہادر ہو۔ مجھے تو تمھاری اس بہادری کے لیے اہتمام کرنا چاہیے۔'' مکڑی نے پہلا پاسا پھینکا۔ مکڑی کی باتیں سن کر روہی مکھی خوشی سے جھوم اٹھی اور کہا:

''مکڑی بی! تم کتنی اچھی ہو، میری قدر صرف تم نے کی۔ باقی تو کوئی بھی

مجھے خاطر میں ہی نہیں لاتا۔''

مکڑی دل ہی دل میں شہد سے بھری شہد کی مکھی کو کھانے کا سوچ رہی تھی۔

جیسے ہی روہی مکھی اپنی بات پوری کرتی ہوئی مکڑی کے قریب ہوئی مکڑی نے اگلے ہی پل شہد کی مکھی کو اپنے جال میں پھنسالیا اور آہستہ آہستہ نگلنے لگی۔

واقعی! ضرورت سے زیادہ خود کو برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

کہاوت کہانی

رمشا رفیق۔ میر پور خاص

آمنہ ساتویں جماعت کی ذہین طالبہ ہے۔ آج آمنہ نے اسکول سے گھر آتے ہی سب کو سلام کیا اور بستہ سوفے پر رکھتے ہی دادی سے سوال کیا:

''دادی! کہاوت اور ضرب المثل کسے کہتے ہیں؟''

آمنہ کی بات سن کر آمنہ کی امی بولیں:

''آمنہ بیٹی! آتے ہی سوال کرنے شروع کر دیے!؟''

آمنہ: ''امی جان! استانی صاحبہ نے آج جماعت میں سب سے پوچھا تھا کہ کہاوت اور ضرب المثل کسے کہتے ہیں؟ اس کا جواب کسی کو بھی نہیں آیا تو اُستانی صاحبہ نے کہا کہ بچو! یہ آپ سب کا ہوم ورک ہے، کل آپ سب اس کا جواب دیں گے۔''

دادی (آمنہ سے): ''بیٹا! آپ ابھی آرام سے اپنے اسکول کے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کھانا کھاؤ، اس کے بعد نماز پڑھنا، پھر میرے پاس آجانا۔''

آمنہ: ''ٹھیک ہے دادی جان!''

شام کے وقت آمنہ نے دادی سے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت لی تو دادی بولیں: ''بیٹا! آجاؤ۔''

آمنہ: ''اب بتائیں دادی! کہاوت اور ضرب المثل کسے کہتے ہیں؟''

دادی: ''جی بیٹا! کہاوت اور ضرب المثل دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ کہاوت کو عربی میں ضرب المثل کہا جاتا ہے۔ کسی واقعے یا قصے کا نتیجہ، جو لگے بندھے الفاظ میں بطورِ مثال بیان کیا جائے کہاوت یا ضرب المثل کہلاتا ہے۔ آمنہ بیٹا! آپ کی سمجھ میں آرہا ہے نا جو میں آپ کو بتا رہی ہوں!؟''

آمنہ: ''جی دادی! کہاوت کو عربی میں ضرب المثل کہتے ہیں۔''

دادی: ''شاباش آمنہ بیٹا! اب آگے سنو۔ کہاوتیں یا ضرب الامثال سینکڑوں سال سے چلی آرہی ہیں، جنھیں ہم آج بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کہاوتوں یا مثالوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسی وجہ، واقعہ یا کہانی چھپی ہوتی ہے جس کے منظرِ عام پر آنے کے باعث وہ کہاوت یا مثل کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ یہ کہاوتیں اور مثالیں حقائق پر مبنی ہوتی ہیں اور حالت اور ماحول کے مطابق استعمال میں لائی جاتی ہیں۔

آمنہ: ''دادی! کیا آپ ایک مثال دے کر سمجھا سکتی ہیں؟''

دادی: ''جی بیٹا! جیسے یہ کہاوت ''آب آب کرتے مر گئے، سرہانے دھرا رہا پانی''۔ اب اس کہاوت سے ایک کہانی منسوب ہے۔ بیٹا! کوئی شخص ہندوستان سے باہر گیا اور وہاں سے فارسی زبان سیکھ کر واپس آیا۔ اپنی فارسی دانی پر اُسے بہت ناز تھا۔ اتفاق سے وہ بیمار ہو گیا اور طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ وہ پیاس کی شدت میں آب آب کہہ کر پانی مانگتا رہا، لیکن کوئی اس کی بات نہ سمجھ سکا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا، حالاں کہ پانی اس کے سرہانے ہی رکھا ہوا تھا۔

اس مناسبت سے گویا کہاوت میں تنبیہ ہے کہ گفتگو ہمیشہ ایسی زبان میں کرنی چاہیے جسے لوگ سمجھتے ہوں۔ اپنی قابلیت کے زعم میں ایسی زبان استعمال کرنا سراسر نادانی ہے جس سے لوگ ناواقف ہوں۔

آمنہ: ''شکریہ دادی! آپ نے مجھے اتنے بہترین انداز سے سمجھایا۔ میں نے یہ سب اپنی کاپی میں لکھ لیا ہے، تاکہ یاد رہے۔ میں یہ سب باتیں اپنی جماعت کی ساتھیوں کو بھی بتاؤں گی۔''

دادی: ''جی بیٹا! یہ آپ نے بہت اچھا کیا، اور ہاں ایک بات اور، کہاوت کی جمع کہاوتیں اور ضرب المثل کی جمع ضرب الامثال ہے۔

نجات کی رات

محمد مبشر عطاری۔ شیخوپورہ

''ابا جان! اب مان بھی جایئے نا! آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟''

حسن پچھلے آدھے گھنٹے سے بضد تھا کہ اسے اس دفعہ شب برات، یعنی پندرہ شعبان کی رات کو پٹاخے پھاڑنے ہیں، لیکن ابو نہیں مان رہے تھے۔

''دیکھو بیٹا! یہ ایک بُرا فعل ہے اور ہم مسلمان ہیں، ہمیں ایسے کام زیب نہیں دیتے۔'' ابو نے حسن کو سمجھایا۔

''ابو! میرے سارے دوست پٹاخے پھاڑیں گے تو میں کیوں نہیں پھاڑ سکتا؟'' حسن کسی طرح بھی سمجھنے کو تیار نہ تھا۔

''اچھا، آپ یہ بتائیں کہ شبِ براءت کا مطلب کیا ہے؟'' ابو نے حسن سے پوچھا کیا۔

''ہمم..... پتا نہیں۔'' حسن نے سر کھجاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''شبِ براءت کا مطلب ہے: ''نجات کی رات۔'' ابو نے مطلب بتلایا۔

''ابو! اسے نجات کی رات کیوں کہا جاتا ہے؟'' حسن نے موضوع میں دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹا! نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے:

'بے شک اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرھویں رات کو آسمانِ دنیا پر تجلّی فرماتا ہے اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ لوگوں کو بخش دیتا ہے۔

(ترمذی، ج ۲، ص: ۱۸۳، حدیث: ۷۳۹ ملخصاً)

اسی لیے اس رات کو شبِ براءت کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔'' ابو نے وضاحت کی۔

''یہ تو یقیناً بہت عظیم رات ہے، لیکن ابو! پٹاخے وغیرہ پھاڑنے میں کیا مسئلہ ہے؟'' حسن نے پوچھا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا دین اس سے منع کرتا ہے، کیوں کہ ایک تو رات کے وقت آتش بازی لوگوں کے آرام میں خلل کا باعث ہے اور دوسرے یہ کہ آتش بازی سراسر پیسے کا ضیاع ہے اور دینِ اسلام ہمیں فضول خرچی سے منع کرتا ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِؕ-وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝

(بے جا خرچ نہ کیا کرو، کیوں کہ بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔)

(مفہوم آیت، سورۂ بنی اسرائیل: ۲۶، ۲۷)

''ابو جان! میں سمجھ گیا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ! اب میں نہ صرف خود پٹاخے پھاڑنے سے بچوں گا، بل کہ اپنے دوستوں کو بھی روکوں گا۔'' حسن نے پُرعزم لہجے میں کہا اور پھر ابو سے پوچھا:

''ابو! اس رات میں ہمیں کرنا چاہیے؟''

''ہمیں اس رات میں زیادہ سے زیادہ ذکر و اَذکار اور نفلی عبادات کرنی چاہییں۔'' ابو نے حسن کے اس عمدہ سوال پر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

یوں حسن میاں نے شبِ براءت کے مفہوم کو سمجھا اور پھر اُس پر عمل بھی کیا۔

بقیہ: ننھے نمازی

آج جب بچے نماز پڑھنے آئیں گے تو اُن کے ذہن میں نماز کی اہمیت پختہ ہوتی جائے گی اور مستقبل میں وہ بغیر کہے نماز کے پابند ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!''

حافظ صاحب منبر سے اتر کر سنتوں کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے اور باقی لوگ بچوں کو اپنے ساتھ کھڑا کرنے لگے۔

سوال آدھا، جواب آدھا ۲۸

کے درست جوابات

۱ پندرھویں نمبر پر۔

۲ آپ رضی اللہ عنہ بھی حضور نبی کریم ﷺ کے چچا تھا۔

۳ 27 سال کی عمر میں (اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی ساری زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی۔)

۴ وہ سن جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے روم میں رائج تھا۔

۵ ابنِ الہیثم (آپ کی طبیعیات کے موضوع پر لکھی گئی اس مایہ ناز کتاب کو دنیا کی سب سے پہلی اور جامع کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم باب ''آنکھ'' سے متعلق ہے۔ مذکورہ کتاب ابنِ الہیثم نے 18 سال میں مکمل کی تھی)۔

۶ پاکستان۔

۷ 3، جولائی 1953ء (اس پہاڑی چوٹی کی بلندی 26,660 فٹ ہے)۔

۸ 31۔

۹ سپیرو گراف (Spherograph)۔

۱۰ دکان تو خوب سجائی گئی ہے، لیکن اس پر بکنے والا مال خراب ہے۔

بدتہذیبستی

زرین فاطمہ۔ کراچی

دادا ابو عشا کی نماز پڑھنے کے بعد کچھ دیر مسجد میں تعلیم میں بیٹھتے۔ یہ ان کا معمول تھا، پھر تسبیح کرتے ہوئے گھر تشریف لاتے۔

آج معمول کے مطابق گھر تشریف لائے اور حسبِ عادت برآمدے میں قدم رکھتے ہی ان کا سر چکرا گیا۔

ان کا پانچ سالہ پوتا ٹیبلٹ میں گیم کھیلنے میں مگن تھا، جب کہ سات سالہ پوتی اسمارٹ فون میں طرح طرح کے منہ بناتی سیلفیاں لینے میں مصروف تھی۔ برابر میں اُن کا بڑا بیٹا اور بچوں کا والد لیپ ٹاپ پر کسی کام میں مصروف تھا۔ دیوار پر لگی اسکرین پر کوئی سیاسی پروگرام بھی چل رہا تھا، جس کی طرف کسی کا بھی دھیان نہیں تھا۔

دادا ابو نے استغفار کرتے ہوئے اسکرین بند کی تو سب کا دھیان ٹوٹا۔

’’چھوٹے میاں تو چھوٹے، بڑے میاں سبحان اللہ!‘‘

دادا ابو طنزیہ بولتے ہوئے صوفے پر بیٹے کے برابر آ بیٹھے۔

سرمد صاحب نے سر کھجاتے ہوئے لیپ ٹاپ بند کر کے ایک طرف رکھا۔

’’میاں! تم بچوں کی یہ تربیت کر رہے ہو؟ تم لوگوں کو کافی دیر پہلے میں ایسے ہی چھوڑ کر گیا تھا اور تاکید کی تھی کہ نماز کے لیے مسجد آ جانا۔ بچے اپنے بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں، لیکن تمھیں نہ اذان کا احترام کہ اونچی آواز میں پروگرام چل رہا تھا، نہ نماز کا ہوش، غضب خدا کا!‘‘

دادا ابو طیش میں آ چکے تھے۔

’’ابا! ہم بس اٹھنے ہی والے تھے۔‘‘ سرمد صاحب ابا حضور کے سامنے

بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔

''آج کھانے کے بعد سب میرے کمرے میں آنا۔''

دادا ابو حکم دیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

.....☆.....

''ہم لوگ چھوٹے تھے تو سب بچے روزانہ شام کو گلیوں میں خوب سائیکلیں چلاتے تھے، بھاگتے دوڑتے تھے، فٹ بال یا کرکٹ کھیلتے تھے۔ کوئی نہ کوئی مشغلہ ایسا ہوتا تھا کہ خوب پسینا آتا تھا اور رات کو نہا کر سونا پڑتا تھا، اسی لیے ہم اتنے صحت منداور چاق و چوبند ہوتے تھے۔''

دادا جی بولتے ہوئے اسی سہانے دور میں کھو گئے تھے۔ سب ان کے کمرے میں موجود بہت اشتیاق سے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔

''اب یہ سب کھیل اسمارٹ فون میں آ گئے ہیں، جس کی وجہ سے بچے تمام وقت ایک ہی جگہ بیٹھے رہتے ہیں، اسی وجہ سے بہت سی نت نئی بیماریاں بھی متعارف ہوگئی ہیں، جن کا ہمارے دور میں کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

کیوں چھوٹے میاں! صحیح کہہ رہا ہوں نا!؟'' دادا ابو نے پانچ سالہ پوتے سے تائید لی۔

''جی دادا ابو! میرے سارے دوست بھی آن لائن گیمز کھیلتے ہیں۔'' وہ انگلیوں پر گیمز کے نام گنوانے لگا۔

''آج کل کے آن لائن گیم کھیلنے والے بچوں کو کیا پتا کہ ہمارے دور میں کیسے کیسے کھیل ہوا کرتے تھے!'' دادا ابو مسکراتے ہوئے بولے۔

''جی ابو! ہمارے دور کے کھیلوں کا انھیں کیا پتا! ہم کیسے کھیلتے ہوئے پورے محلے میں اودھم مچایا کرتے تھے اور پہلی باری لینے پر کیسے دست و گریباں ہوا کرتے تھے۔''

''پھر گھر آ کر اماں سے چھتر پریٹ بھی ہوا کرتی تھی۔'' دادا ابو نے سرمد صاحب کی باتوں میں ٹکڑا جوڑا تو سب ہنس پڑے۔

آج کافی عرصے بعد یوں سب مل بیٹھ کر پرانی یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔

''موبائل فون ایجاد ہونے سے پہلے انگوٹھے کا مقصد کیا تھا؟ کبھی سوچا آپ نے؟'' دادا ابو نے بچوں سے سوال کیا۔

''کسی کو 'شیم شیم' کرنے کے لیے استعمال کرتے ہوں گے۔''

سات سالہ پوتی سوچتے ہوئے بولی۔

دادا ابو نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر چپت لگائی۔

''چیزوں کو پکڑنے میں انگلیوں کی مدد کرنا یا کسی کو او۔ کے کہنا ہو تو انگوٹھا دکھا دینا یا سڑک پر لفٹ مانگنا۔''

سرمد صاحب نے ہنستے ہوئے سب کی معلومات میں اضافہ کیا تو سب ہنس پڑے۔

''لوگوں کے پاس پہلے دور میں بہت وقت ہوتا تھا۔'' دادا جی گہری سانس لیتے ہوئے گویا ہوئے۔

''کوئی ضروری کام نہ ہو تو لکھنے پڑھنے، گھر کے کام کرنے، آپس میں گپ شپ لگانے یا ایویں پیدل گھومنے کے لیے بھی ڈھیر سارا وقت مل جاتا تھا۔

اب انسان نے اپنا سارا وقت سوشل میڈیا، فیس بک، واٹس ایپ، ٹوئٹر، یوٹیوب کو دے دیا ہے۔ ہم غیر ارادی طور پر موبائل فون کے غلام بن گئے ہیں اور ہمیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے۔''

دونوں بچے غور سے دادا جی کی باتیں سن رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دادا جی نے انھیں ایک نئی راہ دکھائی تھی۔

سرمد صاحب شرمندگی سے دادا جی سے یہ عہد کر رہے تھے کہ وہ اپنی پرانی روایات کو اَب ہرگز نظر انداز نہیں کریں گے۔ ہر کام کا ایک وقت متعین کریں گے۔ صبح کے وقت چہل قدمی بھی کریں گے اور شام کے وقت بچوں کو کھلی فضا میں سانس لینے اور کھیلنے کے لیے باغ میں بھی لے کر جائیں گے۔

''اور اَبا جان! ایک دل چسپ بات بتانا تو میں بھول گیا۔'' سرمد صاحب مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''صحت عامہ کے لیے کام کرنے والی ایک برطانوی تنظیم، حکومت اور سوشل میڈیا چلانے والی کمپنیوں سے مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ موبائل فون میں ایسا آپشن لگائیں کہ اگر کوئی مسلسل دو گھنٹے تک سوشل میڈیا پر مصروف ہو تو فون پر ایسا پیغام آئے جس میں اسے بتایا جائے کہ وہ بہت دیر سے سوشل میڈیا اور موبائل میں مصروف ہے۔''

''واہ بھئی! یہ تو بہت زبردست ہو جائے گا۔'' دادا ابو یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئے۔

پیارے قارئین! کیا آپ حضرات بھی خوش ہوئے ہیں یہ خبر سن کر!

شکر

ڈاکٹر الماس روحی۔ کراچی

وہ ایک گھنا جنگل تھا، جس کے پاس ایک خوب صورت تالاب تھا۔ جنگل کے سارے جانور خوشی خوشی تالاب سے پانی پیتے اور نہاتے دھوتے۔ یہاں ایک بھالو آتا تھا جو بہت موٹا تازہ تھا۔ وہ شوق سے کچالو کھاتا تھا۔ سب جانور اُسے ''آلو کچالو'' کہتے تھے۔ بس چوہے اسے ''ماموں ماموں'' کہتے نہ تھکتے تھے، جب کہ خالہ بلی کو وہ اپنا خالو لگتا تھا۔ اسے نہانا اچھا لگتا تھا۔ وہ پانی میں جب ڈُبکی لگاتا تو اُسے بہت مزہ آتا۔

اسی جنگل میں ایک چھوٹا سا ہاتھی تھا۔ وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ''ببلو'' اس کا پیارا سا نام تھا۔ ماں کو اُس کی بہت فکر رہتی تھی۔ وہ روز اُسے تالاب میں کھڑا کر کے اپنی سونڈ میں پانی بھر بھر کر نہلاتی۔ وہ چھپ چھپ پانی میں پاؤں مارتا۔ ایسا کرنے سے اسے بہت لطف آتا تھا۔ وہ کبھی خوشی سے دم ہلاتا، کبھی اپنی سونڈ ہوا میں گھماتا اور بی بطخ کے تالاب میں تیرتے بچوں پر رُعب جماتا۔ وہ ابھی چھوٹا تھا، اس لیے شیر سے گھبراتا تھا۔ اس کے دادا کی شیر سے دوستی تھی۔ ایک دن وہ اسے شیر کے پاس لے گئے تھے۔ ننھے ہاتھی کے کرتب دیکھ کر شیر بہت خوش ہوا تھا۔

اسی تالاب میں سفید بطخوں کا ڈیرا تھا، جو صبح شام قیں قیں، قیں قیں کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں، جس نے تالاب جیسی نعمت دی تھی۔ اسی تالاب کے کنارے ایک مینڈک بیٹھتا تھا، جو دن رات اداس رہتا اور کڑھتا رہتا۔ ایک دن ننھے ہاتھی نے اس سے پوچھا:

''تم اتنے اداس کیوں رہتے؟'' بھالو بولا:

''اس مینڈک کو اپنی شکل اچھی نہیں لگتی۔''

ننھے ہاتھی نے حیرت سے مینڈک کو دیکھا۔

''ہاں، نہ میری شکل اچھی ہے نہ عقل۔'' سب کہتے ہیں: میں عقل کا کچا ہوں۔ میری آواز بھی بُری ہے۔ لمبی لمبی میری ٹانگیں ہیں اور گول گول، سرخ سرخ میری آنکھیں ہیں۔'' اس نے آنکھیں باہر نکال کر کہا۔

بھالو اور ننھا ہاتھی ہنسنے لگے۔

''تم ہنس رہے ہو، کیا میں جوکر ہوں؟ دیکھو، میری زبان کتنی لمبی ہے۔'' اس نے منہ سے زبان باہر نکالی اور پھر آنکھیں پھاڑتے ہوئے بھالو کی طرف دیکھا۔

''خالو بھالو! دیکھو، میری آنکھیں ہیں نا گول گول۔'' اتنے میں تالاب سے ایک بڑی مچھلی نکلی اور بولی:

''مینڈک بھیا! زبان کا سب سے بڑا حق ہے: اللہ اللہ کرنا۔ جب تم ٹرٹر، ٹرٹر کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو۔ رہی آنکھیں، آنکھیں تو میری بھی چھوٹی سی ہیں، مگر میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں ان آنکھوں سے دیکھ سکتی ہوں، لہٰذا شکر اَدا کرتی ہوں۔ میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ میرے ہاتھ ہیں نہ پاؤں۔ میں تو لمبی لمبی سی ہوں، تیرتی ہی رہتی ہوں۔ سردی میں تیل میں تلی جاتی ہوں۔ روز جیتی اور روز مرتی ہوں۔ کوئی چھوئے تو ڈرتی ہوں۔ پانی سے نکلتی ہوں تو مرتی ہوں۔ میں کتنی عجیب سی ہوں، لیکن میں یہ سب نہیں سوچتی۔ بس دن رات اپنے اللہ تعالیٰ کا شکر اَدا کرتی ہوں، جس نے مجھے تیرنا سکھایا اور پانی کو میرا جیون بنایا۔''

بطخ بولی: ''ہاں بھیا مینڈک! مچھلی نے صحیح کہا۔''

اتنے میں تیز ہوا چلی۔ طوفانی بارش کے آثار نظر آنے لگا۔ بھالو اور ننھا ہاتھی اپنے گھر کی طرف چل دیے۔ طوفان سے ڈر کر مینڈک نے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔

مچھلی بولی: ''دیکھا، مینڈک اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کا کمال!'' مسکرانے لگا۔ مچھلی کی باتیں اسے اچھی لگیں۔ اب وہ ہر بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ لمبی زبان، سرخ، گول آنکھیں، اپنی ٹرٹر، ٹرٹر کرتی آواز، اسے اب اچھے لگنے لگے ہیں۔

نیرون کوٹ!

جی ہاں، یہی حیدر آباد کا قدیم نام تھا۔ اس نام کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ ”نیرون“ سندھ کے ایک ہندو راجا کا نام تھا جس نے یہ شہر بسایا تھا، جب کہ ”چچ نامہ“ میں درج روایت کے مطابق ”جس جگہ شہر کا قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اس جگہ کا نام نیرون تھا۔“ اسی نسبت سے اسے ”نیرون کا قلعہ“ کہا جانے لگا اور بعد میں یہی نام ”نیرون کوٹ“ مشہور ہوا۔

نیرون کوٹ میں اسلام کی روشنی چھٹے اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت کے دوران میں پہنچی تھی۔

712ء میں اسلام کے کم سن سپہ سالار محمد بن قاسم کی قیادت میں مسلمانوں نے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ انھوں نے سب سے پہلے دیبل (موجودہ کراچی) اور اُس کے بعد ٹھٹھہ کو فتح کر کے یہاں اسلام کا پرچم لہرایا۔ اس کے بعد نیرون کوٹ اور برہمن آباد کو تسخیر کرتے ہوئے سندھ کے مغرور راجا، داہر کے پایہ تخت ”اروڑ“ (روہڑی) پہنچے۔ یہاں حق و باطل کے درمیان تاریخ ساز معرکہ لڑا گیا، جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ راجا داہر جنگ کے دوران میں مارا گیا اور یوں پورا سندھ سلطنتِ اسلامیہ کا حصہ بن گیا۔

715ء میں محمد بن قاسم کے عراق واپس جانے کے بعد سندھ سو سال سے زائد عرصے تک خلافتِ بنواُمیہ کا حصہ رہا اور اُس کے بعد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔

1175ء میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ”اُچ شریف“ اور ٹھٹھہ کو فتح کر کے سلطنتِ غور کا حصہ بنا دیا۔

1296ء میں خاندان خلجی کے دوسرے حکمران علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت میں اس کے سپہ سالار نصرت خان نے نیرون کوٹ اور ٹھٹھہ کو فتح کر کے خلجی سلطنت میں شامل کر دیا۔ اس کے بعد یہ شہر خاندانِ تغلق سومروں، سموں، ارغونوں اور ترخانوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا سلطنتِ مغلیہ میں شامل ہوا۔

1701ء میں میاں یار محمد کلہوڑا نے چھٹے مغل بادشاہ محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر سے سندھ کی صوبے داری کا اجازت نامہ حاصل کیا اور یہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کی۔

1736ء میں میاں یار محمد کلہوڑا کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا میاں نور محمد کلہوڑا تخت نشین ہوا۔

1756ء میں نور محمد کلہوڑا کا انتقال ہوا تو اُس کے بیٹے میاں غلام شاہ کلہوڑا نے سندھ کی حکومت سنبھالی۔ اس نے نیرون کوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کرایا اور خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لقب ”حیدر“ سے منسوب کرتے ہوئے اس شہر کا نیا نام ”حیدر آباد“ رکھا اور اسے اپنی حکومت کے پایہ تخت کا درجہ دیا۔ میاں

ح سے حیدر آباد

الطاف حسین۔ کراچی

غلام شاہ کلہوڑا سندھ کا وہ حکمران تھا جس نے 1758ء میں انگریز تاجروں کو سندھ میں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دی تھی۔

1771ء میں میاں غلام شاہ کلہوڑا کے انتقال کے بعد میاں غلام نبی کلہوڑا نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

1783ء میں حیدر آباد کے مشہور قصبے ''ہالا'' کے قریب تالپوروں اور کلہوڑوں کے درمیان ''جنگِ ہالانی'' کا آغاز ہوا۔ میاں غلام نبی کلہوڑا نے جب تالپوروں کا پلّا بھاری دیکھا تو میدان جنگ سے فرار ہوگیا۔

تالپوروں نے سندھ کے دیگر شہروں پر تو قبضہ کرلیا تھا، لیکن حیدر آباد کا قلعہ کلہوڑوں کے قبضے میں تھا۔ غلام نبی کلہوڑا کی بہادر والدہ اور کلہوڑا فوج کے سپہ سالار جنرل شالمین شیدی کی مشترکہ جنگی حکمتِ عملی کے نتیجے میں یہ قلعہ دو سال تک کلہوڑوں کے قبضے میں ہی رہا۔

بعد ازاں ایک کلہوڑا سپاہی کی غداری کی وجہ سے قلعے کی فصیل میں سوراخ ہوگیا اور تالپور فوج قلعے کے اندر داخل ہونے میں کام یاب ہوگئی۔ اس قدر سنگین صورتِ حال کے باوجود جنرل شالمین شیدی اور اُس کی فوج نے تالپور فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن جب شالمین شیدی کو تالپور فوج نے گرفتار کرلیا تو اُس کی فوج کا حوصلہ پست ہوگیا اور اُس نے ہتھیار ڈال کر قلعہ تالپور فوج کے حوالے کردیا۔ میر بجار خان تالپور کے بیٹے میر فتح خان تالپور کو متفقہ رائے سے سندھ کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ میر فتح خان تالپور نے بھی حیدر آباد کو اپنی مملکت کے دارالحکومت کا درجہ دیا۔

تالپوروں کے دور میں سندھ کے گوشے گوشے میں علم کی شمعیں فروزاں ہوئیں۔ سیکڑوں تعلیمی ادارے اور دینی درس گاہیں قائم کی گئیں۔ اس کے علاوہ عوام کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیے گے۔ تالپوروں کی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کے دورِ حکومت کے دوران میں باقاعدہ نصابِ تعلیم مرتب کیا گیا۔

1808ء میں میر غلام خان تالپور نے حکومت سنبھالی تو انگریز اپنی روایتی عیاری سے کام لیتے ہوئے اس سے ایک تجارتی معاہدہ کرنے میں کام یاب ہوگئے، جس کی رُو سے وہ آزادانہ طور پر سندھ میں تجارتی معاملات انجام دینے لگے۔

1839ء میں چال باز انگریزوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تالپوروں سے اپنی علاحدہ فوج رکھنے کی اجازت بھی حاصل کرلی اور آہستہ آہستہ اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تالپوروں کے حکومتی اور سیاسی معاملات میں بھی دخل اندازی شروع کردی۔ جب تالپوروں نے اعتراض کیا تو فریقین کے درمیان اختلافات بڑھ گئے، جس کے نتیجے میں فروری 1843ء میں انگریز فوج جنرل نیپئر کی قیادت میں ''میانی'' کے مقام پر تالپور فوج کے خلاف صف آرا ہوئی۔ انگریز فوج کی تعداد 2800 تھی، جب کہ تالپوروں کی فوج کی تعداد 20 ہزار سے زائد تھی، لیکن اس دور کے مطابق انگریز فوج کے پاس جدید اسلحہ موجود تھا، جس کی بدولت اس نے تالپور فوج کو شکست دے کر حیدر آباد سمیت سندھ کے دیگر کئی شہروں پر قبضہ کرلیا اور تالپور خاندان کے آخری حکمران ''میر نصیر خان

تالپور'' کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا، (جہاں وہ قید کی حالت میں فوت ہو گئے)۔

1935ء میں انگریز حکومت نے حیدرآباد کو ضلع کا درجہ دے کر کراچی کو صوبہ سندھ کا نیا دارالحکومت بنا دیا۔

سندھ پر انگریزوں کا تسلط تقریباً ۱۰۴ سال ۶ ماہ تک قائم رہا۔

14، اگست 1947ء کو جب پاکستان قائم ہوا تو صوبہ سندھ کے تمام شہر بشمول حیدرآباد اُس کے نقشے میں سما گئے۔

کراچی سے قومی شاہ راہ پر 192 کلومیٹر مشرق کی طرف سفر کرنے کے بعد آپ ماضی کے نیرون کوٹ اور حال کے حیدرآباد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ریل گاڑی کے ذریعے بھی سندھ کے سابقہ دارالحکومت تک پہنچ سکتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد حیدرآباد نے تعلیمی، صنعتی، تجارتی اور ثقافتی شعبہ جات میں نمایاں ترقی کی ہے۔

اس وقت حیدرآباد میں متعدد اِسکولوں اور کئی کالجوں کے علاوہ تین یونی ورسٹیاں بھی قائم ہیں۔ قانون کی تعلیم کے دو اِدارے، جناح لاء کالج اور سندھ لاء کالج بھی قائم کیے گئے ہیں۔

شہر سے تقریباً گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ''میانی'' کے نہری جنگل میں محکمہ جنگلات کے زیرِ انتظام ایک زرعی تحقیقاتی مرکز بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس شہر میں نوجوانوں کو ہنر سکھانے کے لیے ٹیکنیکل ادارے اور خواتین کو دست کاری کی تربیت دینے کے لیے کئی اسکول بھی قائم کیے گئے ہیں۔

ایشیا کا سب سے بڑا ''شہری ہوابازی کا تربیتی مرکز'' بھی اسی شہر میں قائم کیا گیا ہے، جہاں پاکستان کے دیگر شہروں کے علاوہ دوسرے ایشیائی ممالک سے بھی طلبہ شہری ہوابازی سے متعلقہ علوم سیکھنے آتے ہیں۔

''سول ایوی ایشن'' کے اس ٹریننگ سینٹر میں ایئر ٹریفک کنٹرول، نیوی گیشن ایڈ، فائر فائٹنگ، ایئر پورٹ مینجمنٹ سمیت تقریباً ساٹھ کورسز کرائے جاتے ہیں۔

حیدرآباد میں مطالعے کے شائقین کے لیے کئی چھوٹی بڑی لائبریریاں قائم کی گئی ہیں۔ ان میں حسرت موہانی لائبریری اور سندھ میوزیم لائبریری پاکستان کی بڑی لائبریریوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

حیدرآباد کے صنعتی علاقے میں بہت سے صنعتی ادارے قائم ہیں، جن میں سُوتی کپڑا، ریشمی کپڑا، بناسپتی گھی، چینی، پلاسٹک، بلیڈ، پنکھا سازی، سامان آرائش، صابن، سیمنٹ، شیشہ اور شیشے کی مصنوعات، چمڑا رنگنے اور جوتا سازی، انجینئرنگ کا سامان، مشروب اور لوہے کا سامان تیار کرنے کے کارخانے شامل ہیں۔

حیدرآباد کی گھریلو صنعتوں میں چوڑی سازی کی صنعت نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ یہاں کے ماہر کاری گروں کے ہاتھوں کی بنی ہوئی خوب صورت اور دیدہ زیب چوڑیاں نہ صرف پاکستان میں، بل کہ دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

حیدرآباد کا قصبہ ''ہالا'' جاذبِ نظر، دِل کش دست کاری اور لکڑی پر خراد کے بہترین کام کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ یہاں منقش گل دان، روغنی برتن، سنگار سیٹ، میز پوش، اجرک، سندھی ٹوپیاں، جوتے، جھولے، قالین، سوفہ سیٹ، پلنگ کے پائے اور ٹائلز تیار کیے جاتے ہیں۔

حیدرآباد میں برآمدات کے فروغ کی غرض سے ایک ''ڈرائی پورٹ'' بھی تعمیر کی گئی ہے، جہاں سے حیدرآباد میں تیار کی جانے والی صنعتی اشیا ملک کے دیگر شہروں کو بھیجی جاتی ہیں۔

حیدرآباد کی زرعی پیداوار میں گیہوں، گندم، مکئی، چاول، جوار، باجرا، تِل، کپاس کے علاوہ مختلف اقسام کی دالیں اور کئی اقسام کی سبزیاں

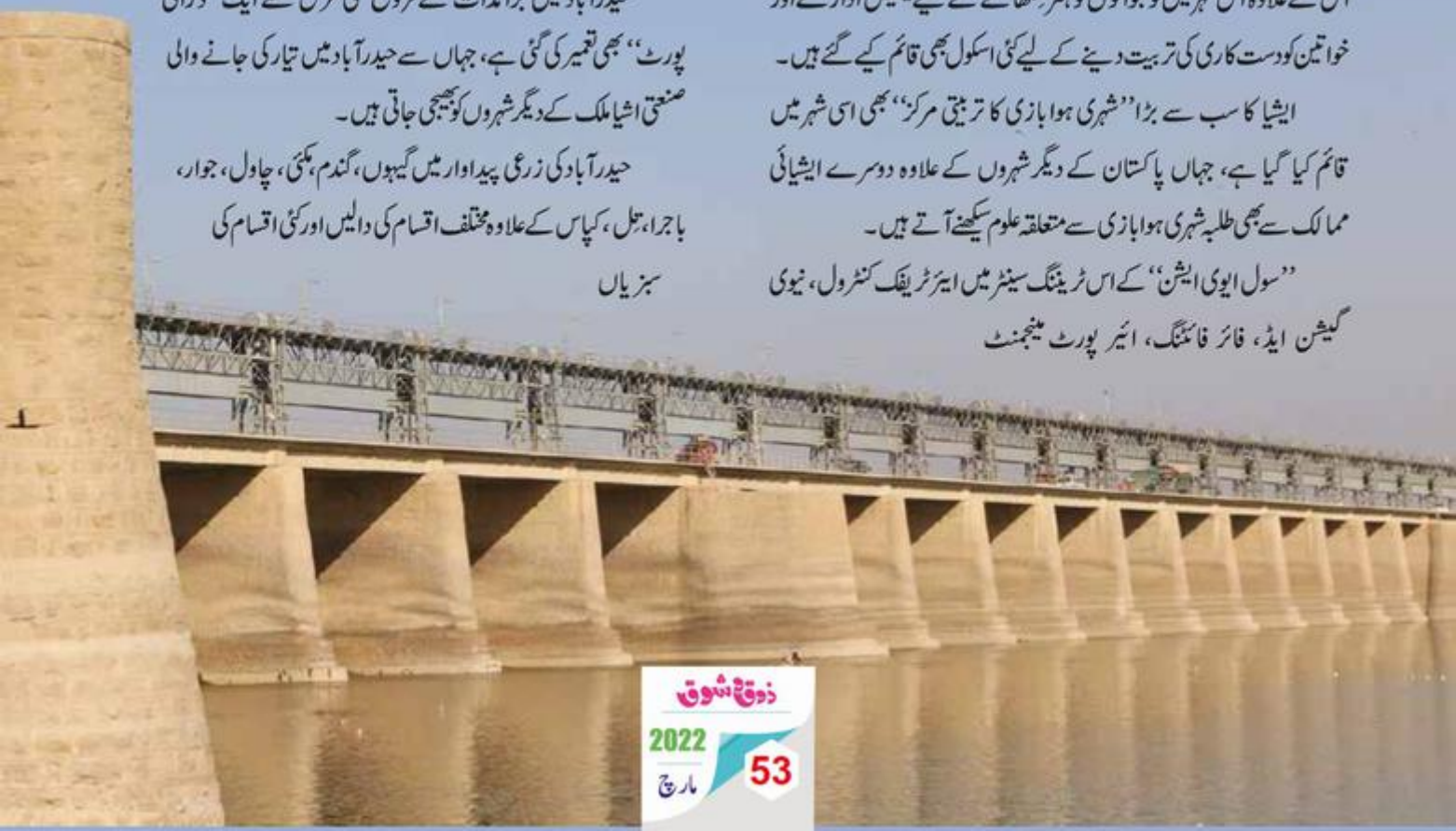

اور پھل بھی شامل ہیں۔

حیدرآباد سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر جام شورو کے مقام پر کوٹری بیراج واقع ہے۔ 1955ء میں بنایا جانے والا یہ بیراج چوالیس دروازوں پر مشتمل ہے اور اس سے چار نہریں نکالی گئی ہیں، جو حیدرآباد ڈویژن کے دو کروڑ اسّی لاکھ مربع ایکڑ رقبے کو سیراب کرتی ہیں۔

(حیدرآباد ڈویژن میں ضلع حیدرآباد، ضلع سانگھڑ، ضلع ٹھٹھہ، ضلع دادو، ضلع بدین، ضلع تھرپارکر اور ضلع میرپور خاص شامل ہیں۔)

حیدرآباد میں کھیلوں کے فروغ کی غرض سے کئی چھوٹے بڑے گراؤنڈ بنائے گئے ہیں۔ ''نیاز اسٹیڈیم'' کا شمار ملک کے مشہور اور تاریخی کرکٹ گراؤنڈ میں ہوتا ہے۔

حیدرآباد کی تفریحی گاہوں میں عائشہ پارک، رانی باغ، میران پارک، شام داس پارک، میونسپل گارڈن اور چڑیا گھر وغیرہ شامل ہیں۔

پکا قلعہ میوزیم، سندھ پروویژنل میوزیم اور سندھ یونی ورسٹی کا شعبہ ''سندھ لوجی'' میں قدیم اور نادر و نایاب اشیا جمع کی گئی ہیں۔

قلعہ شیخ مکی، قلعہ حیدرآباد (رقبہ پانچ لاکھ مربع گز)، غلام شاہ کلہوڑا کا مقبرہ، غلام نبی کلہوڑا کا مقبرہ، میر کرم علی خان تالپور کا مقبرہ اور عیدگاہ، حیدرآباد کی تاریخی یادگار ہیں۔

1955ء میں حیدرآباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا تھا، جسے قیام پاکستان کے بعد قائم ہونے والے دوسرے ریڈیو اسٹیشن کا اعزاز حاصل ہے۔

حیدر آباد کا مشہور و معروف ''شاہی بازار'' بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تین کلومیٹر لمبا بازار حیدرآباد کے قلعے سے ٹاور مارکیٹ تک پھیلا ہوا ہے اور سندھ کے بڑے تجارتی مراکز میں شمار ہوتا ہے۔

حیدرآباد، ریلوے لائن کے ذریعے پاکستان کے چاروں صوبوں سے مربوط ہے۔ سُپر ہائی وے اس شہر کو کراچی سے ملاتا ہے۔ نیشنل ہائی وے کے ذریعے اس شہر کو صوبہ پنجاب اور صوبہ خیبر پختونخواہ سے ملایا گیا ہے، جب کہ انڈس ہائی وے کے ذریعے یہ شہر صوبہ بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ اور دیگر شہروں سے ملا ہوا ہے۔ حیدرآباد ایئرپورٹ سے کراچی، اسلام آباد، لاہور، سکھر، نواب شاہ، سُوئی اور موہنجوداڑو کے لیے پروازیں روانہ ہوتی تھیں۔

اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ ''ہوادانوں کے شہر'' (حیدرآباد) تک کس ذریعے سے رسائی حاصل کرتے ہیں؟

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی
کی زیر سرپرستی الحمدللہ گزشتہ ۱۵ برس سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

اس شمارے میں بچوں/بچیوں کے لیے تعلیم، تربیت اور تفریح سے بھرپور مواد ہوتا ہے، جس کا بچوں/بچیوں کو انتظار رہتا ہے۔ یہ رسالہ بچوں کے ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور ملک میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں میں ایک امتیازی شان کا حامل ہے۔

اگر آپ اپنے بچوں/بچیوں کو فی زمانہ چھوٹی بڑی اسکرین سے بچانے کے لیے کسی متبادل کی تلاش میں ہیں تو ماہ نامہ ذوق و شوق کافی حد تک آپ کی امیدوں پر پورا اُتر سکتا ہے۔

اس کے لیے آپ اپنے نام، مکمل ڈاک پتے اور جس ماہ سے رسالہ جاری کروانا ہے اس ماہ کا نام لکھ کر صرف گیارہ سو (1,100/=) روپے جمع کروائیں اور ہر ماہ، ماہ نامہ ذوق و شوق گھر بیٹھے حاصل کریں۔

(شمارے کی قیمت بڑھنے کی صورت میں سالانہ خریداری کی رقم میں اضافہ ہوسکتا ہے۔)

خط و کتابت کا پتا:
ماہ نامہ ذوق و شوق، کراچی
پی۔او۔بکس نمبر: 17984
گلشن اقبال، کراچی۔
پوسٹ کوڈ: 75300
ذوق شوق/Zouq shouq
zouqshouq@hotmail.com

سالانہ خریداری کے لیے چار ذرائع سے آپ رقم جمع کروا سکتے ہیں:

1 منی آرڈر کے ذریعے۔
اس کے لیے ہمارا پتا ہے: ماہ نامہ ذوق و شوق، کراچی، پی۔او۔بکس نمبر: 17984، گلشن اقبال، کراچی۔ پوسٹ کوڈ: 75300

2 بینک اکاؤنٹ کے ذریعے۔ بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کے لیے ہمارا میزان بینک اکاؤنٹ یہ ہے:
اکاؤنٹ ٹائٹل: Bait ul ilm Trust Zouq o Shouq اکاؤنٹ نمبر: 0179-0103431456
(نوٹ: بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کی رسید آپ ہمیں اس نمبر پر (0324-2028753) واٹس ایپ کردیں۔)

3 دستی۔
دفتر میں آکر رقم جمع کروانے کے لیے ہمارا پتا ہے: مدرسہ بیت العلم، ST-9E، نزد الحمد مسجد، گلشن اقبال بلاک ۸، کراچی
(نوٹ: دستی رقم جمع کرواتے وقت سالانہ خریداری فارم ضرور پُر کریں۔)

4 جازکیش کے ذریعے۔
اپنی سالانہ خریداری کی رقم اس نمبر پر بھیج دیں: 0320-1292426
(نوٹ: رقم جمع کروانے کے بعد اس نمبر پر مطلع کردیں۔)

کوپن برائے بلاعنوان ۱۷۵

نام: ______________ ولدیت: ______________

مکمل پتا: ______________

فون نمبر: ______________

کوپن برائے ذوقِ معلومات ۷۴

نام: ______________ ولدیت: ______________

مکمل پتا: ______________

فون نمبر: ______________

سوال آدھا جواب آدھا ۳۰

نام: ______________ ولدیت: ______________

مکمل پتا: ______________

فون نمبر: ______________

ہدایات: جوابات ۳۱، مارچ ۲۰۲۲ء تک ہمیں موصول ہو جانے چاہییں...... ☆ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا......

☆ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔

SINCE 1999
KIDS COLLECTION SHOES
New Eid Arrival
رسالہ ساتھ لانے پر اور آن لائن کے لئے اشتہار کی تصویر واٹس اپ کرنے
پر 10% ڈسکاؤنٹ دیا جائیگا۔
Shopping Online At
Whatsapp: 0316-2709797
Facebook: /kidscollectionshoes
Website : www.kidskcs.com
Branch 1: Shop # 09, Star Centre, Near Chawala Centre,
Main Tariq Road, Karachi.
Tel: 021-34315359
Branch 2: Shop # 01, Saima Paari Glorious Opp.
Sindh Lab Main Tariq Road, Karachi.
Tel: 021-34382622

سلسلہ

تحفۃ الدعاء

دعا عظیم نعمت اور انمول تحفہ ہے، دعا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس سے راز و نیاز کا ذریعہ ہے، دعا مایوسی میں امید کی کرن ہے، دعا کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام مسائل حل کروا سکتے ہیں، اس دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی حال میں دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اسی فکر کے پیشِ نظر "مکتبہ بیت العلم" نے تحفۃ الدعا سیریز کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ! اس سیریز کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

MaktabaBaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk